مکتی بودھ
راجندر سنگھ بیدی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
اشتراک
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

مکتی بودھ

راجندر سنگھ بیدی

۱۹۸۲

مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ

باقر مہدی کے نام

فہرست

افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل

میں معافی چاہوں گا کہ اس مضمون کو کھولنے کے لیے مجھے اپنی ذات میں سے ہو کر گزرنا پڑ رہا ہے۔ آپ اس لیے بھی در گزر کریں گے کہ اتنی بڑی مخلوق کی میں بھی اکائی ہوں ایک، اس لیے سب کو سمجھنے کے لیے میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ پہلے میں آپ کو سمجھ لوں۔

افسانوی تجربہ کیا ہے؟ مجھے افسانہ سازی کی لت کیسے پڑی؟ اگر یہ مجھے اور میرے کچھ دوستوں کو پڑی، تو باقی دوسروں کو کیوں نہیں پڑی؟ کیوں نہیں میں کسی فرنانڈس کی طرح گرجے کے سامنے بیٹھا موم بتیاں بیچتا؟

فن کسی شخص میں سوتے کی طرح نہیں پھوٹ نکلتا۔ ایسا نہیں کہ آج رات آپ سوئیں گے اور صبح فنکار ہو کر جاگیں گے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں آدمی پیدائشی طور پر فنکار ہے، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں صلاحیتیں ہیں، جن کا ہونا بہت ضروری ہے، چاہے وہ اسے جبلّت میں ملیں اور یا وہ ریاضت سے ان کا اکتساب کرے۔ پہلی صلاحیت تو یہ کہ وہ ہر بات کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محسوس کرتا ہو، جس کے لیے ایک طرف تو وہ داد و تحسین پائے اور دوسری طرف ایسے دکھ اٹھائے جیسے کہ اس کے بدن پر سے کھال کھینچ لی گئی ہو اور اسے نمک کی کان سے گزرنا پڑ رہا ہو۔

دوسری صلاحیت یہ کہ اس کے کام و دہن اس چرند کی طرح سے ہوں، جو منہ چلانے میں خوراک کو ریت اور مٹی سے الگ کر سکے۔ پھر یہ خیال اس کے دل کے کسی کونے میں نہ آئے کہ گھاسلیٹ یا بجلی کا زیادہ خرچ ہو گیا، یا کاغذ کے ریم

کے ریم ضائع ہو گئے۔ وہ جانتا ہو کہ قدرت کے کسی بنیادی قانون کے تحت کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ پھر وہ ڈھیٹ ایسا ہو کہ نقش ثانی کو ہمیشہ نقش اوّل پر ترجیح دے سکے۔ پھر اپنے فن سے پرے کی باتوں پہ کان دے۔۔۔ مثلاً موسیقی، اور جان پائے کہ استاد آج کیوں سر کی تلاش میں بہت ہی دور نکل گیا ہے۔ مصوّری کے لیے نگاہ رکھے اور سمجھے کہ وشی واشی میں خطوط کیسی رعنائی اور توانائی سے ابھرے ہیں۔ اگر یہ ساری صلاحیتیں اس میں ہوں تو آخر میں ایک معمولی سی بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ جس اڈیٹر نے اس کا افسانہ واپس کر دیا ہے، نااہل ہے!

اس کے بعد کوئی بھی چیز افسانے کے عمل کو چھیڑ (TRIGGFER OFF) سکتی ہے مثلاً کوئی راہ جاتا اس کی پگڑی اچھال دے یا کوئی ایسا حادثہ پیش آ جائے، جس پہ اس غریب کا کوئی بس نہ ہو اور جو اسے بے سلامتی کا شکار کر دے اور وہ اپنے دل میں ٹھان لے کہ مجھے اس بے تعاون، بے رحم دنیا میں کہیں جگہ پانا ہے، کچھ بن کے دکھانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک آدمی خطرے سے دوچار نہیں ہوتا، اس میں مدافعت کی وہ قوّتیں نہیں ابھرتیں، قدرت کے پاس جِن کا بہت

بڑا خزانہ ہے۔

نو عمری میں یہ سب باتیں میرے ساتھ ہوئیں اور مجھے یقین ہے کہ تھوڑے یا زیادہ فرق کے ساتھ دوسرے فنکاروں پر بھی بیتی ہوں گی۔ اکثر لوگوں کو حادثے پیش آتے ہیں اور وہ گوناگوں مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں، لیکن یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ وہ فن کے راستے سے گزرنے کی بجائے کسی اور طرف مڑ لیے۔ صدر ہر جا کہ نشیند، صدر است۔ انہوں نے یا تو اپنے مخصوص کام میں جھنڈے گاڑے اور یا تھک ہار کر جنّت کو سدھارے۔ گویا بے عزّتی اور پے در پے حادثوں کے بعد کچھ کرنے، بن کر دکھانے کے سلسلے میں اپنے ملک کے ہر اردو داں نوجوان کی طرح غزل کہنے کی کوشش کی، لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ کیوں کہ چھوٹی عمر ہی میں میری شادی ہو گئی تھی۔۔۔ آپ میری بات سمجھیے۔۔۔ کوئی معشوق میرے سامنے تھا ہی نہیں۔ اگر تھا تو مجھے بچہ سمجھ کر ٹال جاتا تھا۔ اگر وہ رکے تو میری بیوی جوتا پکڑ کر اسے ہنکال دیتی تھی۔

میں نے تو یہ پڑھ رکھا تھا کہ عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے میں چپکے سے بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور کرتا ہی رہ گیا۔ میں نے ہجر و وصال، وفا و

بے وفائی، رقیب و محتسب کے مضمون شاعروں کے تطبع میں باندھے، مگر وہ سب مجھے جھوٹے اور کھوکھلے لگتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ محتسب تو میں خود ہوں۔ رقیبِ روسیاہ کی کیا مجال جو فرسنگ بھی میرے گھر کے پاس پھٹکے۔ یہ تو شادی کے اَن لکھے معاہدے کی دوسری مد ہے، جس کی رو سے اگر رقیب کو قتل نہیں کیا جاسکتا، حوالات تو بھجوایا جاسکتا ہے۔

بہت کم لوگ ہیں جو فیض کی طرح رقیب کے ساتھ رشتہ پیدا کرسکتے ہیں اور اس کے افادی پہلو سے واقف ہیں۔ گویا زندگی جو بھی تعلیم مروّجہ شعر کے سلسلے میں دیتی تھی، میں اس میں کوراہی رہا۔ اس کے برعکس میڈم زندگی نے تلافیِ مافات میں مجھے دوسرے مسئلے دے دیے۔ مثلاً خانہ داری کے مسئلے، روزگار کے مسئلے جو کسی طرح بھی عشق کے مسائل سے کم نہ تھے۔ حالات نے ایسا جمود پیدا کردیا اور بدن میں ایسی کپکپی کہ لاہور کے لنڈے بازار سے خریدا ہوا، مرانجامرانجا اینڈ کو کا پرانا، پھٹا ہوا گرم کوٹ بھی مجھے نہ بچاسکا۔

بس، بہت ہولی۔ اب میں اپنی بات بند کرتا ہوں، کیوں کہ گرم کوٹ کے بعد میرے ساتھ کیا ہوا اور کیا نہ ہوا، یہ کچھ لوگ جانتے ہیں۔ بلکہ کیا نہیں ہوا کے

بارے میں انہیں مجھ سے زیادہ واقفیت ہے۔

افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں۔ ہے، تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے۔ مبتدی اس بات کو نہیں جانتا اور افسانے کو بحیثیت فن، شعر سے زیادہ سہل سمجھتا ہے۔ پھر شعر، فی الخصوص غزل میں آپ عورت سے مخاطب ہیں، لیکن افسانے میں کوئی ایسی قباحت نہیں۔ آپ مرد سے بات کر رہے ہیں، اس لیے زبان کا اتنا رکھ رکھاؤ نہیں۔ غزل کا شعر کسی کھُردرے پن کا متحمل نہیں ہو سکتا، لیکن افسانہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ نثری نژاد ہونے کی وجہ سے اس میں کھردراپن ہونا ہی چاہیے، جس سے وہ شعر سے ممیز ہو سکے۔

دنیا میں حسین عورت کے لیے جگہ ہے تو اکھڑ مرد کے لیے بھی ہے، جو اپنے اکھڑ پن ہی کی وجہ سے صنفِ نازک کو مرغوب ہے۔ فیصلہ اگرچہ عورت پہ نہیں، مگر وہ بھی کسی ایسے مرد کو پسند نہیں کرتی جو نقل میں بھی اس کی چال چلے۔ ہمارے نقّادوں نے افسانے کو داد بھی دی تو نظم کے راستے سے ہو کر، نسق کی راہ سے نہیں۔ جس سے اچھے اچھے افسانہ نگاروں کی ریل پٹڑی سے اتر گئی اور جو نہیں

اتری تھی تو ایسی توصیف سے متاثر ہو کر انہوں نے خود، اپنے ہاتھوں سے اپنی لائن کے نٹ بولٹ ڈھیلے کر لیے۔

یہ طے بات ہے کہ افسانے کا فن زیادہ ریاضت اور ڈسپلن مانگتا ہے۔ آخر اتنی لمبی اور مسلسل بحر سے نبرد آزما ہونے کے لیے بہت سی صلاحیتیں اور قوّتیں تو چاہئیں ہی۔ باقی اصنافِ ادب، جن میں ناول بھی شامل ہے، ان کی طرف جزواً جزواً توجّہ دی جا سکتی ہے، لیکن افسانے میں جزو و کل کو ایک ساتھ رکھ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اس کا ہر اول، متد اول اور آخری دستہ مل کر نہ بڑھیں تو یہ جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔ شروع سے لے کر آخر تک لکھ لینے کے بعد پھر آپ ایک لفظ بڑھانے یا دو فقرے کاٹ دینے ہی کے لیے لوٹ سکتے ہیں۔ ایزاد و اضافے کی بہ نسبت میں نے بے خیالی میں قائم نہیں کی، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ افسانے میں ایزاد، اضافے سے زیادہ ضروری ہے۔ آپ کو ان چیزوں کو قلم زد کرنا ہی ہو گا، جو بجائے خود خوبصورت ہوں اور مجموعی تاثر کو زائل کر دیں یا مرکزی خیال سے پرے لے جائیں۔

اب میں ایک چونکا دینے والی بات کرنے جا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اردو زبان

نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ افسانے کے سے فنِ لطیف کو اس طریقے سے سمجھ سکے یا قبول کر سکے، جیسے سمجھنا یا قبول کرنا چاہیے۔ میری اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ پیچھے مُڑ کر دیکھیے کہ ہر آن آپ نے ڈکشن پہ کچھ زیادہ ہی زور دیا ہے۔ اس عمل کا گراف بنایا جائے تو وہ میرؔ، انیسؔ اور غالبؔ کے بعد داغ تک نیچے ہی آتا ہوا دکھائی دے گا۔ معلوم ہوتا ہے، ہم نے 'فسانۂ آزاد' کو افسانہ یا ناول ہی سمجھ کر پڑھا۔ ہم نے اس کا مقابلہ (VANITY FAIR) سے کیا ہے۔ ہم نے آغا حشر کو ہندوستانی شیکسپیئر بھی کہا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ ہم نے دونوں میں سے کسی ایک کو نہیں پڑھا اور اگر پڑھا تو فرق کو نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ پونا فلم اور ٹیلی وژن انسٹیٹیوٹ میں ممتحن کی حیثیت سے جب میں نے ایک امیدوار سے سوال کیا۔۔۔ آپ کو کون سے مصنّف پسند ہیں تو اس نے آنکھ جھپکے بغیر جواب دیا، "مجھے تو دو ہی مصنف پسند ہیں سر! گلشن نندہ اور شیکسپیئر!"

کبھی ہمایوں اور ادبی دنیا، دونوں رسالے فیاض محمود اور عاشق بٹالوی کی توصیف میں کالے تھے۔ اور آج ہم ہی افسانے کی تاریخ میں ان بے چاروں کا ذکر تک نہیں کرتے۔ ہم نے افسانے میں زورِ بیان کو اس قدر سراہا ہے کہ ادب تو ایک

طرف، خود ادیب کو نقصان پہنچایا ہے۔ افسانے میں اظہار کے تخلیقی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ گریز کا ہے۔ لیکن ہمارے شغب آشنا کان گریز کو عجز بیان کا نام دیتے ہیں۔ ہم ابھی تک داستان گوئی، فلسفہ رانی اور تاریخی واقعات کو آج یا کل کے کرداروں کی معرفت پیش کر دیے جانے پر سر دھنتے ہیں۔ سر دُھننے سے مجھے کچھ وہ نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ تو ہم کچھ بھی کر کے دھنیں گے ہی کہ وہ ہماری عادت ثانیہ ہو چکی ہے مگر تکلیف اس وقت ہوتی ہے، جب ہم خطیب، مورّخ اور فلسفہ بردار کو ہی افسانہ نگار کا نام دیتے ہیں۔

افسانہ کوئی سودیشی (INDIGENOUS) شے نہیں۔ ہم نے جا تک کہانیاں لکھیں۔ کتھا سرت ساگر لکھی اور ہم سے لوگ انہیں مغرب لے گئے۔ جہاں انہوں نے کہانی کو فن بنا دیا۔ ہیئت میں بے شمار تجربے کیے، جن سے استفادہ کرنے میں ہمیں کوئی عار نہیں ہے۔ افسانے کے فن کو چھوڑیے، کسی بھی فن کو جانچنے پرکھنے کے لیے عالمی پیمانے پر اسے جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں کوئی علاحدگی (ISOLATION) نہیں ہے۔ ملکوں اور قوموں کی حدیں نہیں ہیں۔ بشرطیکہ آپ منٹو کو موپساں اور مجھے چیخوف کے نام سے نہ

پکارنے لگیں۔ حالانکہ یہ ممکن ہے میں خود کو کاوا باٹا کہلوانا پسند کروں۔ آپ کو کیسا لگے گا اگر میں کہوں کہ رام لال اور جوگندر پال ہندستان کے ہیزش بوہل ہیں اور قرۃ العین حیدر، ہان سویان۔ مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں ہے، بشرطیکہ ہان سویان کے ہم وطن اسے اپنے دیس کی قرۃ العین حیدر کہیں۔

عجیب دھاندلی ہے نا۔ معلوم ہوتا ہے اردو اسم با مسمّا ہوتی جا رہی ہے۔ ہیزش بوہل کا ایک کردار جو جج ہے، کہتا ہے، ''ایسے مقدمے میں انصاف قسم کی کوئی چیز ہی نہیں، کیوں کہ ملزم اس کا تقاضا ہی نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی آمریت ہے، جس میں انفرادی اظہار اور اخلاق سہو زمانی (ANACHRONISTIC) بات ہے۔۔۔''

مذکورہ ریاضت اور عالمی پیمانے پہ گرد و پیش کی آگہی کے بعد ہی افسانے پر عبور حاصل ہوتا ہے اور جب یہ بات ہو جاتی ہے تو افسانہ لکھنے والے کے اضطرار (REFLEXES) کا حصّہ ہو جاتا ہے۔ نہ صرف آپ کی بے ارادہ بات سے افسانے کا مواد مل سکتا ہے، بلکہ ہر موڑ، ہر نکّڑ پہ افسانے بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور وہ تعداد میں اتنے ہیں کہ انہیں سمیٹتے ہوئے افسانہ نگار کے ہاتھ

قلم ہو جائیں۔ بہر حال افسانوی تجربے پر عبور حاصل ہو جانے کے بعد افسانہ نگار کو یونان کے اساطیری کردار 'میڈاس' کا وہ لمس مل جاتا ہے، جس سے ہر بات سونا ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہندستان کا افسانہ نگار سونے کو بھی چھوتا ہے تو وہ افسانہ ہو جاتا ہے۔ گھبراہٹ کی بات اس لیے نہیں کہ اتنا سونا پا کر میڈاس بھی بھوکا مرا تھا۔

افسانہ لکھنے کے عمل میں بھولنا اور یاد رکھنا دونوں عمل ایک ساتھ چلتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی ڈگریوں والے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لیٹ۔ اچھا افسانہ نہیں لکھ سکتے، کیوں کہ انہیں بھول نہ سکنے کی بیماری ہے۔ میں ایک دماغی تساہل کی طرف اشارہ کرتا ہوں، جسے منٹو نے میرے نام ایک خط میں لکھا، ''بیدی! تمہاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔'' میں سمجھ گیا کہ منٹو کا مطلب ہے۔۔۔ میری کہانیوں میں کہانی کم اور مزدوری زیادہ ہے۔ مگر میں کیا کرتا؟ ایک طرف مجھے فن اور دوسری طرف زبان سے لوہا لینا تھا۔ اہل زبان اس قدر بے مروّت نکلے کہ انہوں نے اقبال کا بھی لحاظ نہ کیا۔

کسی سے پوچھا آپ اقبال سے ملے تو کیا بات ہوئی؟ بولے، کچھ نہیں میں جی ہاں، جی ہاں، کہتا رہا اور وہ 'ہاں جی، ہاں جی' کہتے رہے۔

اب حالات میں نسبتاً آسانی ہے، یوں کہ سند کے لیے ہمیں کہیں دور نہیں جانا ہے۔ پرسوں ہی ڈاکٹر نارنگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ پاکستان میں ایک تحریک چلی ہے جو شوکت صدیقی اور قرۃ العین حیدر کی پورب سے آئی ہوئی زبان کو ٹکسالی نہیں مانتی۔ بہر حال میں نے منٹو کی تنقید سے فائدہ اٹھایا اور دھیرے دھیرے اپنی کہانی سے ہاتھ کو مار بھگایا لیکن اس کا کیا کروں کہ وہ اِدھر اُدھر سے ہو کر پھر رونما ہو جاتا ہے۔ وہ بے ادائی کی ادا جس کی طرف منٹو نے اشارہ کیا، میرؔ کے الفاظ میں خاک ہی میں مل کر میسّر آتی ہے۔ لیکن یہی بے ادائی اور قلم برداشتگی جہاں منٹو اور کرشن چندر میں مزا پیدا کرتی تھی، وہیں بدمزگی بھی۔

منٹو کی تنقید کی وجہ سے میری حالت عورت کی سی تھی جو مقبوض اور تاراج بھی ہونا چاہتی ہے اور پھر اس کا بدلہ لینا بھی۔ جب میں نے منٹو کے کچھ افسانوں میں لاابالی پن دیکھا تو انہیں لکھا۔۔۔ منٹو، تم میں ایک بڑی بات ہے اور وہ یہ کہ تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو اور نہ لکھتے وقت سوچتے ہو اور نہ لکھنے کے بعد سوچتے ہو۔

اس کے بعد منٹو اور مجھ میں خط و کتابت بند ہو گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ انہوں نے میری تنقید کا اتنا برا نہیں مانا، جتنا اس بات کا کہ میں لکھوں گا خاک، جب کہ شادی سے پرے مجھے کسی بات کا تجربہ ہی نہیں۔ اس پر طرفہ، میں نہ صرف بھینس کا دودھ پیتا ہوں بلکہ اسے پال بھی رکھا ہے۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ اگر اونٹ کا رشتہ مسلمان سے ہے، گائے کا ہندو سے، تو سکھ کا بھی کسی سے ہو سکتا ہے۔

افسانہ ایک شعور، ایک احساس ہے، جو کسی میں پیدا نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ اسے محنت سے حاصل تو کیا جا سکتا ہے لیکن حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی دست بہ دعا ہی رہتا ہے۔ کچھ وافر باتیں سوءِ ہضم کی وجہ سے بھی اس میں آ جاتی ہیں اور کچھ کسی اور ذہنی فتور سے۔ تسکین کی بات صرف اتنی ہے کہ افسانہ ابھی ہمارے ہاتھ سے نکل کر اڈیٹر کے ہاتھ نہیں پہنچا۔ ہم اس میں ایزاد و اضافہ کر سکتے ہیں اور اس پر بات نہ بنے تو پھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ اگر ہیمنگ وے پانچ سو صفحے لکھ کر ان میں سے صرف چھیانوے صفحے کا مواد نکال سکتا ہے، تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

اردو میں بہت عمدہ افسانے لکھے گئے ہیں۔ اگر ان کی تعداد گنی چنی ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے تقاضے پورے کرنے میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ایمان ہاتھ سے جا رہا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ ہم اپنے ہی امیج کے قیدی ہو کر رہ گئے ہیں۔

(یہ مضمون جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے جدید اردو ادب میں زبان کے تخلیقی استعمال کے مسائل پر منعقدہ سیمینار میں خطبۂ صدارت کے طور پر پڑھا گیا۔)

مکتی بودھ

یقین مانیے، اس میں نند لال کا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ وہ کیا کرتا؟ اس کی فلم اَمبِکا، چل گئی تھی۔

میں بھی حد ہوں جو ہندی فلم کے سلسلے میں منطق کی بات کرنے جارہا ہو۔ اس پر میں کہوں گا کہ جس منطق سے ہندی فلم فیل ہوتی ہے، اسی سے چل بھی جاتی۔ جیسے اسے کوئی ضد ہو جاتی ہے، چلنے یا نہ چلنے کی۔ ایسی ہی ضد میں نند لال کی پہلی دو فلمیں پٹ گئی تھیں، حالانکہ ان میں سے ایک میں ہیروئن، اسٹوڈیو کی برسات

میں بھیگی بھی تھی، کپڑے اس کے بدن کے ساتھ چپکے بھی تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کپڑے ایکا ایکی کہیں نیچے چلے گئے ہیں اور بدن چھٹپٹا کے اوپر آ گیا ہے۔ بھیگنے سے پہلے کتنی مفلس اور نادار سی معلوم ہوتی تھی، لیکن جب کیامال دار نظر آ رہی تھی وہ۔

دوسری فلم میں ہیرو نے خالی ہاتھوں، گلدانوں، صوفے کی ٹانگوں، لیمپ شیڈ، شنر یلیر کی زنجیروں اور جانے کن کن ہتھیاروں سے کاؤ بوائے، ولین اور اس کے درجن بھر ساتھیوں کو فراش کر دیا تھا۔ کیسے وہ الٹے شاٹ میں اچھل کر میز نائین فلور پر پہنچ جاتا تھا، جہاں ایک رسّہ ہوتا ہے۔ ہمیشہ ہوتا ہے، جس پر وہ جھولتا ہوا پھر نیچے کے دوزخ میں کود جاتا ہے۔ جبھی وِرودھی دَل میں سے کسی نے آناً فاناً اٹھ کر پانگے سے ہیرو کا سر کاٹ دیا۔ جی، بالکل ہی کاٹ دیا۔ یعنی سر الگ اور دھڑ الگ۔ لوگ ہراساں ہو گئے۔ اب کیا ہو گا؟ ارے یہ تو بالکل ہی مر گیا۔ وہ جانتے تھے کہ فلم کا ہیرو مر ہی نہیں سکتا اور پھر ہراساں بھی ہونا چاہتے تھے۔ ہیروئن کو شادی کیے بنا ہی وِدھوا کر گیا تو اس سنسار کا کیا ہو گا؟ سرشٹی کیسے چلی گی؟ مگر مانیے تو۔ کہاں مرا وہ؟ جبھی دیکھنے میں کنکریٹ کی دیوار سے دیوی

پر کٹ ہو گئی اور نرتیہ کے سب نیموں کا پالن کرتے ہوئے، ہیر و کے پاس چلی آئی۔ اس کے کٹے ہوئے سر کو مُدرا میں اٹھایا۔ ایسے دھیرج سے کہ اسے درد نہ ہو، اور پھر اسے دھڑ کے ساتھ لگا دیا۔ سر لگتے ہی ہیر و نے پہلے ایک چھینک ماری، پھر اٹھا اور ہری بول، کہتا ہوا ایک طرف یوں چل دیا، جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ کوئی دعا نہ سلام، شکریہ نہ ڈنڈوت۔ لیکن جب ہال میں کیا تالیاں پِٹی تھیں۔ اگر فلم کے آخر میں لوگوں نے نند لال کو پیٹ ڈالا، تو اس کی وجہ اسکرین پلے کی غلطی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ دیوی کے ہاتھوں سے تو وہ بچ گیا، لیکن کچھ دیر بعد باہر جا کر سمندر میں ڈوب گیا۔

جب نند لال کوئی بی۔ اے فیل نہ تھا، جیسے اب 'امبِکا' کے بعد وہ پاس نہیں۔ وہ تو وہی تھا۔ فنانس بروکر، جو اپنی حاجتوں کے پیش نظر، روپیہ لوٹا دیے جانے پہ بھی ہنڈی واپس نہ کرتا۔ کہیں سال ایک کے بعد اسے پھر اپنی بھلکڑ اسامی کے سامنے پیش کر دیتا۔ مگر ایک بات ہے، نند لال جب بھی پہلے خود ہر کسی کو نمسکار کرتا تھا جیسے آج بھی کرتا ہے، ورنہ فلموں میں یہ خلافِ وضع فطری بات ہے۔ یہاں تو جو آپ کے سلام کا جواب نہ دے، سمجھو اس کی فلم چل گئی اور اگر آپ سے پہلے

وِش کرے تو گھوٹالا ہوا۔

نندلال کی شکل میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ ہماری آپ کی طرح کا آدمی تھا وہ عام ہندوستانی قد، وہی رنگ روپ، وہی چیچک کے داغ جو بچپن میں بہت نمایاں ہوتے ہیں، لیکن جوانی میں طاقت پکڑنے میں اپنی ہی ایک داب، ایک چھاپ ہو کر رہ جاتے ہیں، بیچ میں عضلات کی سُکڑن چھوڑ جاتے ہیں۔ البتہ جس میں آدمی بات کرنے میں سر کو چھوٹے چھوٹے جھٹکے دیتا ہے، آپ اس سے ادھار لینے جائیں تو آخر دم تک یہی لگتا ہے وہ دے گا، نہیں دے گا، دے گا، نہیں دے گا۔

گونپھا سے گدیوں تک آپ ہندوستانی سنوں کو جمع کریں اور ان کی تعداد سے حاصل جمع کو تقسیم کریں تو جو اوسط نکلتا ہے، وہ نندلال کی شکل ہے۔ نہیں، ایسے شاید میں آپ کو سمجھا نہیں پاؤں گا۔ آپ یہاں سے ایرانی ہوٹل کُولار کی طرف چلیں تو راستے میں دو نکّڑ پڑتے ہیں۔ ان پر لڑنے والے ہر تیسرے الل ّ ٹپ آدمی کی شکل نندلال کی سی ہو گی۔ اب سمجھے نا آپ؟ ٹھیک ہے کرشن کنھیا کا ایک نام نندلال بھی ہے، مگر کرشن کہاں کے گورے چٹّے تھے؟ وہ بھی تو بھارت ورش میں اُتّرا اور دکن کے میل کی ایک ناکام سی کوشش تھے۔

نند لال کو اپنے نام کے عامیانہ ہونے سے بہت چڑ تھی۔ مگر وہ کیا کرتا؟ نام بھی تو وجود کی طرح آدمی کے ساتھ یوں چپک جاتا ہے کہ ایک ہی بار اترتا ہے۔ وہ چڑ دراصل پیدا کی گئی تھی۔ ایسی حرکتیں بالعموم عورتیں کرتی ہیں، اپنے وجود کو بھول کر۔ فلمی لڑکیاں اسے کہتیں، کیا مہابھارت کے زمانے کا نام رکھ دیا تمہارے ماں باپ نے۔ اب اشونی کمار کو دیکھو۔ ہم اسے پیار سے اشو اشو تو پکار سکتی ہیں۔ نندو کیا اچھا لگتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے جیسے ٹھینگا ہے۔ چنانچہ نند لال نے باقاعدہ اور قانونی طور پر اپنا نام دیویندر کمار رکھ لیا، اس امید میں کہ ریحانہ اور جے شری اسے 'دیبو دیبو' کہہ کر پکاریں گی تو کتنا اچھا لگے گا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک پارٹی بھی کی جس میں اسکاچ چلی، کباب کارنر سے افغانی کباب اور تکّے بھی آئے۔ پانچ ساڑھے پانچ ہزار کا خرچ بھی ہوا، لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ ہر دوسرے تیسرے اسے کوئی مِل جاتا اور کہتا، ارے نند لال، سنا ہے تو نے اپنا نام بدل لیا ہے؟ ایک دن رینُو آئی جو پارٹی کے دن آؤٹ ڈور کر رہی تھی۔ بولی، اتنی بڑی پارٹی کر دی، نند لال جی اور ہمیں پوچھا ہی نہیں۔ بیوی کہتی، میں نے تو اسی سے شادی کی تھی، میں کوئی دوسرا نہیں جانتی۔ کوئی میم تھوڑے ہوں میں، جو آج

ایک کے ساتھ ہو اور کل دوسرے کے ساتھ۔ میرا تو وہی ہے۔ اور پھر پاس بیٹھی ہوئی عورت نام لے دیتی۔ نند لال! رول مانگنے کے لیے ایکٹر لوگ دفتر میں آتے ہی تھے، چنانچہ اس دن بھی دیویندر کمار ایسر کا نام پڑھ کر ایک چلا آیا۔ باہر اسٹول پر بیٹھے ہوئے چپراسی نے کہا۔ ہاں، صاحب اندر ہیں۔ ایکٹر اندر جاتے ہی انہیں پاؤں پر واپس چلا آیا، وہاں تو کوئی نہیں، وہی نند لال بیٹھا ہے۔

نند لال کا مکان معمولی تھا اور بیوی بھی معمولی، مگر کچھ نو دولتوں کی باتیں چلی آئی تھیں اس میں۔ امبکائے جانے کے بعد اس نے نئی کار خریدی، لیکن اسے بیوی کی اردل میں دے دیا اور خود اسی کھٹارے میں گھچ گھچ کرتا رہا۔ کیونکہ وہ لکی تھا۔ سپیئر جوتوں کی طرح سے رہنے پر بھی نند لال بڑا مکان لینے سے ڈرتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ کل کلاں شاید اسی میں لوٹنا پڑے، بلکہ اس لیے کہ اس کے بھاگیہ اودے ہونے کی شری گنیش اسی لاطور بھون میں کے دو کمروں اور بالکونی سے ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی کی دیواروں پر اس نے سخت چمکیلے، بھڑکیلے، چکو مارواڑی رنگ پوت لیے تھے۔ فرج، ٹیلی وژن تو آج ہر اننت رام، بے انت سنگھ کے پاس ہوتے ہیں، اس لیے کہیں تو امتیازی شان پانے کی پھڑ پھڑاہٹ اور بیوی کو خوش

کرنے کی لالسا میں اس نے اپنے ڈبل بیڈ کے پائے چاندی سے مڑھوا لیے اور بیوی بار بار پہلو بدل کر اپنے پتی کی بے خوابی کا ساتھ دینے لگی۔ سب کچھ کتنا فراواں اور کم کم معلوم ہوتا تھا۔ ایک وہ وقت تھا جب فرش بھی عرش تھا ان کے لیے اور ایک یہ، جس میں عرش بھی سر پیٹ کر رہ گیا تھا۔ بہرحال نندلال کو جو بھی کرنا تھا، انہی دو کمروں میں اور جو نہیں کرنا تھا وہ بھی انہی میں۔

نندلال کے ارد گرد کی سب چیزیں عامیانہ بلکہ سوقیانہ ہونے کے باوجود ایک چیز بڑی اچھی تھی جو پوربلے جنم کے کسی پھل میں چلی آئی تھی، اور وہ تھی مورننگ گلوری کی بیل جو کیسی بے خودی سے اس کے گھر کی دیواروں پر لپکی تھی۔ اس میں اسکارلٹ اوہارا کے پھول پھوٹ کر ہر آتے جاتے کے اندر لال بخار پیدا کرتے تھے۔ لوگ عام طور سے یہی سمجھتے تھے کہ اس گھر کے باسی کتنے تازہ ہیں، کتنے خوش مذاق ہیں۔ پھر ان کے جلوے میں ریاض کرتی ہوئی کسی لڑکی کی آواز مل جاتی۔

”پنگھٹ پہ نندلال مجھے چھیڑ گیو رے۔“

اور سُدھا، نندلال کی بیوی اُٹھ کر سب کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیتی۔

فلمی اشتر اکیت میں کوئی اکیلا نہیں کھاتا، کھا بھی نہیں سکتا۔ کسی کے امبکائے جاتے ہی سب کے کان ہو جاتے ہیں اور وہ گنگٹوک کی جونکوں کی طرح سے کچھ یوں چمٹتے ہیں کہ آدمی کو پتا ہی نہیں چلتا۔ اِدھر آدمی گرتا ہے، اُدھر جونکیں گر جاتی ہیں۔ نندلال کا سا اصیل آدمی یہی کہتا ہوا پایا جاتا ہے۔ ”اچھا، تم میرے تاؤ کے ممیرے بیٹے ہو، اچھا؟ ہاں، ہاں، سنا تھا تمہارے بارے میں کیا کروں یار، جب سے امبکا چلی ہے، میرا فیوز ہی اُڑ گیا ہے۔ بس، دیوی ماں کی مہربانی ہے، کیا پیو گے ؟“ اور وہ ممیرا بھائی پینے کی بجائے کھانے بیٹھ جاتا ہے اور ہمیشہ کھاتا رہتا ہے۔

رات بیوی جب میاں کے ساتھ بھنچ کر لیٹتی ہے تو کہتی ہے، ”ہائے جی! تمہارے پِتا کا تو بڑا بھائی تھا ہی نہیں کوئی۔“

”ایں؟“ نندلال کہتا ہے، ”ان کا کوئی دوست ہو گا۔ سو جاؤ، سرمت کھاؤ میرا۔“

ہیرالال پانچواں ورن ہے جو آد سے چلا آیا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ منو مہاراج کی گنتی میں کیوں نہیں آیا؟ پیڑ الگ، پتے الگ تو دیمک اور ارض بھی الگ ہوتے ہیں۔

اور آج تو اس پانچویں ورن کے بناوافر پیسے اور 'امبکا' کا کوئی حل ہی نہیں۔

جتنا آپ اس کاسہ لیس نسل کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے، اتنی ہی اس میں لچک، اتنا ہی چونچال پن اور مقاومت پیدا ہو جائے گی۔ کچھ دیر کے بعد کاکروچ اور چوہے زہر کی گولیاں ہضم کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ آج کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اسے خوشامد پسند نہیں۔ نہیں وہ خدا سے بھی بڑا ہو گیا۔ پھر آپ اگر پہلو بدلتے ہیں تو یہ ورن بھی نیا پینترا پیش کرنا جانتا ہے۔ آج کا طفیلیا کبھی بھی سیدھے سیدھے مرد کو عقل مند اور عورت کو خوبصورت نہیں کہتا۔ وہ ہمیشہ کہتا ہے، ناک کیسی بھی ہے، مگر تمہارے چہرے پر پھبتی ہے، بھابی۔ خوبصورتی کا یہی مطلب نہیں کہ رنگ گورا ہو۔۔۔ آج کل تو۔۔۔

رنڈ سالا۔۔۔ سارا دن اپنی زبان اور سامنے والے کے کان کی مالش کرتا رہتا ہے۔ یہ جو آدمی سُدھا اور نند لال کے پاس آیا تھا، اس کا نام ہیرا تھا۔ شاید لال بھی ہو۔۔۔ ہیرالال۔ ناصر، جوشی، پانڈے، رام نو اس کے طریقے الگ تھے اور ہیرا لال کے الگ۔ وہ فلموں میں پلے بیک سنگر ہونے آیا تھا۔ ہیرا آج کے زمانے کا آدمی تھا۔ اس کی شکل ماڈ تھی اور عقل بھی ماڈ۔ اس کے بال بے طرح لمبے تھے

اور گھنے، گھناؤنے۔ انسان کے ہونے کے بجائے وہ کسی گھوڑے کے معلوم ہوتے تھے۔ مگر برِل کریم کی کرشمہ سازی سے اطاعت پذیر ہو کر وہ کنڈل اور کڑیاں بن کر کاندھے اور گلے میں لٹک رہے تھے۔ ہیرالال جس کا مقدر پانچواں ورن تھا، یوں پہلے ورن کا آدمی تھا۔ برہمن، اس کا رنگ کھِلتا ہوا تھا اور سرخ بھی، جیسے پلّے سے پی ہو۔ گول چہرے کو لمبی قلموں نے فلینک کر رکھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راج بھون ہے جس کے پھاٹک پر گارڈ ہاتھوں میں بندوقیں لیے کھڑے ہیں۔ بُشرٹ عنابی، فلیئر ز سیمابی۔ ایسا تضاد ناداری کی وجہ سے ہوتا ہے اور یا پھر اس وقت جب آدمی کپڑے کی حد سے گزر جاتا ہے اور فن کے اوج کو چھو لیتا ہے۔ اس کی سپتم کا 'سا' کہیں گلے میں بیٹھ گیا تھا۔ جب وہ گاتا تو عورتوں میں کوئی بے نام سے جذبے پیدا ہو جاتے۔

ہیرالال کی بھی انٹری فلم جگت میں آبائی جائیداد کو بیچ کر آنے سے ہوئی۔ اس نے بھی فلم بنائی اور خدا آپ کا بھلا کرے، مار کھائی۔ اس کے گرد بھی پانچویں ورن کے بیسیوں آدمی جمع ہو گئے اور اسے جینیئس ثابت کر کے چلتے بنے۔ کتنے سانپ لوٹے ہوں گے ہیرالال کے سینے پر جب اپنی ہی فلم میں اسے پاپولر پلے

بیک سنگر کو لینا پڑا کیونکہ میوزک ڈائریکٹر نامی تھا اور اس نے ضد پکڑ لی تھی۔ یہاں کوئی کسی نئے آدمی کو آزمانے کی ہمّت نہیں رکھتا، یہ جانتے ہوئے کہ کسی وقت وہ بھی تو نیا تھا اور کسی نے اسے چانس دینے کی حماقت کی تھی۔ ایک خلا اور خوف ہیں جو ہر آن فلم انڈسٹری کے اذہان کا احاطہ کیے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے بھی کسی دوسرے بڑے کے سہارے بڑے پکاتے ہیں۔

ہیرا کو غلط فہمی تھی کہ اس کی فلم اس بڑے پلے بیک سنگر کی وجہ سے پٹی۔ اس کا یہ وہم خود پرستی پر نہیں تو اور کس بات پر مبنی تھا؟ وہ یہ جاننا ہی نہ چاہتا تھا کہ فلم کی آمریت میں پلے بیک سنگر تو ایک معدنی شے ہے، پیسے کی آکسیجن بنانے کے لیے جسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اصل بات تو ہیرو ہے اور ہیروئن۔ اور کہیں کہیں بیچ میں ڈائریکٹر۔

رہ رہ کر ہیرا کو مکتی بودھ کی یاد آتی تھی۔ وہ ہوتے تو اس کی یہ درگت نہ ہوتی۔ مکتی بودھ اپنے زمانے کے ٹاپ کے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ کبھی پورے دیس میں ان کی دھنیں گونجی تھیں۔ لیکن جب سے چوری یاری رواج ہوئے، وہ پچھڑ گئے۔ تعیش کے اس قانون میں وہ یک زوجہ آدمی، عمر بھر ایک ہی محبوبہ کو

نہارتے رہے، جواب ان کا منہ چڑاتی، انہیں گالی دیتی تھی اور جس کا نام تھا، سنگیتا بھارتی۔

اس پر بھی مکتی بودھ اسی جوش و خروش سے خلاّقی کی باتیں کرتے تھے۔ لوگ انہیں منہ پر تو کچھ نہ کہتے، لیکن کچھ دور جا کر ہنس دیتے۔ ان کی غزل تک کا بھیس اب بھی پہاڑی، تلک کامود، یا گوڑی پوربی ہوتا، حالاں کہ آج کا تقاضا تھا کہ سر شوپاں کا ہو، دھڑ ہریسن کا اور پاؤں۔۔۔ کسی کے بھی۔

ہیرا کا بال بال قرض میں بندھ گیا تھا اور اب وہ اس منزل پر پہنچ گیا تھا، جس میں آدمی آخر بے حیائی اختیار کر لیتا ہے۔ کپڑے جھاڑ کر اٹھتا اور تشنجی انداز میں پورے بازو پھیلا کر کہتا ہے۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس دینے کو۔ بگاڑ لو جو بگاڑنا ہے میرا۔ سیٹھ لوگ سوچتے اب اس کا اور بگڑ ہی کیا سکتا ہے؟ حوصلے والے اس کے لیے دعا کرتے، پچیس پچاس اور بھی دے کر جاتے، تھڑُدِلے دیواروں سے سر ٹکراتے اور یا پھر کچہریوں میں دھکّے کھاتے۔

کبھی ایک ہاتھی میرے ساتھی کو ہیرا نے فلیٹ لے کر دیا تھا۔ احتیاج میں ہیرا اسی میں اٹھ آیا، لیکن وہاں بھی فون پر فون آنے لگے۔ یہ آلہ جو کروڑوں کا

کاروبار کرتا ہے اور یا پھر عاشقوں کی چوچو مُو مُو کی ترسیل، ہیرا کے لیے پھنیرا سانپ ہو گیا۔ آخر ایک سہانی صبح کو ہیرا کے اس پروردے نے اس کا سامان اٹھا کر سڑک پر رکھ دیا، جو سامان بھی نہ تھا۔

وہاں، راشن کی دکان کے نکّڑ سے، جو اب ہیرا کا رین بسیرا ہو گیا تھا، ایک ہی خوبصورت چیز دکھائی دیتی تھی۔ نندلال کے مکان پر لپکی ہوئی بیل۔

مگر جب 'امبکا' شروع بھی نہیں ہوئی تھی تو ہیرا نے نندلال کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ 'مبادا' کے انداز میں اسے نمستے کرتا تھا اور وہ 'شاید' کے انداز میں جواب دیتا۔ پھر پبلک لیٹرین کے نل سے دھوئے بنائے ہوئے کپڑوں میں ہیرالال، شری روکڑا کے پاس گیا، جو بہت ہی نامی پروڈیوسر تھا۔ لیکن اس نے اپنے اس نیازمند کو دیکھنے تک کی پروانہ کی۔ ہیرا کچھ سمجھ گیا۔ جب تک کوئی آدمی خود کو کسی کے لیے ناگزیر نہ بنالے، کام چلتے ہیں بھلا؟ اس نے رگھو دلال سے دوستی دہرالی اور ناز سینما کے پاس کافی ہاؤس میں جانے لگا۔ جہاں کسیلی کافی کی ایک پیالی اور بھُنے سڑے ہوئے کیشیو نٹ کے چند دانوں پہ فلم والوں کی قسمت بن یا بگڑ جاتی ہے۔ رگھو نے ہیرا کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ ہیرا آخر دم تک یہی سمجھتا رہا،

رگھو وہ سب میرے لیے کر رہا ہے۔ مگر وہ تو روکڑا کے انگوٹھے کا نشان چاہتا تھا۔

اپنے سیٹھ سے بات کر لینے کے بعد رگھو، ہیرا کے ساتھ روکڑا کے ہاں پہنچا۔ اتنے کم سود پر کسی کو پیسا ملے تو کون چھوڑتا ہے؟ جتنا بڑا پروڈیوسر ہو، اتنا ہی سود کم لگتا ہے اور جتنا سود زیادہ ہو، اتنا ہی پروڈیوسر کم ہو جاتا ہے۔

روکڑا کو فون ہو چکا تھا۔ جب ہیرا اور رگھو، بلکہ رگھو اور ہیرا اس کے پاس پہنچے تو انہوں نے خود آ کر دروازے پر اس جوڑی کو ریسیو کیا۔ اپنے فلمی سیٹ کے سے آفس میں چیک ٹی سیٹ میں انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی اور پلائی۔ باتوں میں جب روکڑا صاحب نے کہا۔ ہاں، ہاں، میں ہیرالال جی کو بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں، تو دونوں ہیرالال اور رگھو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہیرا نے ناز سے، رگھو نے نیاز سے۔ پھر انگوٹھے کا نشان یعنی دستخط وغیرہ ہوئے، رقم اس جیب سے اس جیب میں گئی اور دونوں خوش خوش لوٹے۔ کچھ ہی دِنوں میں ہیرالال کو پتا چل گیا۔

ہیرالال نے دیکھا اس کی اصل جگہ وہی ہے، جہاں روکڑا صاحب کا چپراسی بیٹھتا ہے۔ باہر وہی دروازے پر کی سرخ بتی صاحب کے مصروف ہونے کی نشاندہی کر

رہی تھی۔ ہیرا باہر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ صاحب مصروف بھی رہے گا تو کتنا۔۔۔ دو گھنٹہ، چار۔۔۔ پانچ۔۔۔ اسے خبر نہ تھی، گھنٹے دن میں بدل سکتے ہیں اور دن مہینوں میں۔

بیچ میں رگھو نے ہیرا کو اس عالم میں دیکھا بھی اور کہا، ''تو تو کہتا تھا روکڑا تیرا بڑا یار ہے، یار؟''

''وہ تو میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔'' ہیرا لال نے گھبرا کر جواب دیا، آخر انسان ہے، اس سے کبھی مصروفیت ہو ہی جاتی ہے۔

''ہے بھگوان۔۔۔ مجھے آخر چاہیئے کیا تھا۔ یہی نا، ایک پلے بیک، روکڑا کے پاس۔''

یہ ایسے ہی تھا، جیسے کوئی مفلس اوپر دیکھ کر کہتا ہے۔۔۔ اللہ! میں تجھ سے آخر مانگتا ہی کیا ہوں، یہی دو روٹیاں نا؟

ہیرا کی فریاد اس مفلس کی فریاد سے بھی زیادہ اندوہ گیں تھی۔ غریب، خدا کے ساتھ جُوا کھیلتا بھی ہے، تو اسٹیک کیا ہوتا ہے اس کا، یہی دس پیسے نا۔۔۔؟

روکڑا دوسرے کروڑ کی فکر میں ہے۔ میں ابھی پہلے کروڑ کی۔۔۔ اور ہنسی، جو رونا بھی نہ تھی۔

پیسہ اس کے پاس آتا ہے، جس کے پاس پیسہ ہو۔ اس لیے ہیرا بھیک مانگ کر بھی کچھ پیسے جیب میں ڈال لیتا تھا، سوگند لے کر کہ وہ اس گداگری کو پیشے کے طور پر کبھی اختیار نہیں کرے گا۔

کام اس کے پاس آتا ہے، جس کے پاس پہلے ہی کام ہو۔ اس لیے ہیرا صریحاً جھوٹ بولتا تھا۔۔۔ پانچ پکچروں میں پلے بیک دے رہا ہوں میں۔ کوئی شروع نہیں ہوئی، کوئی ہو رہی ہے۔ گویا اس نے تین روپے کمائے، جن میں دو کھوٹے تھے اور ایک چل نہیں رہا تھا۔ جو چل نہیں رہا تھا، اسے تین صرافوں کو دکھایا، جن میں سے دو اندھے تھے اور ایک کو دکھائی نہیں دے رہا تھا، وغیرہ۔۔۔

بیچ میں ہیرا کی کِلتی بودھ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ کہ ان کی حالت اور بھی خستہ ہو گئی ہے۔ ہیرا لال کو ان کی باتوں سے پتا چلا۔ بریشم قلندر! جسے میرے پاس آنا ہے آئے، نہیں آنا نہ آئے۔ میں نا گیا کسی کے پاس۔ غضب خدا کا، یہ گھمسان کا میوزک دینے کے بعد بھی اگر لوگ مجھے بھول گئے ہیں تو بھول جائیں۔

اور پھر، یہ ہو کیا رہا ہے دنیا میں۔ جھوٹ کا مول ہے، سچ انمول ہو کر رہ گیا ہے۔

مُکتی بودھ کو چاہیئے تھا گھر سے باہر نکلتے، تاکہ اسے دیکھ کر ہی کسی کو تو بھولے بسرے یاد آ جائے اور کچھ نہیں تو کھلی ہوا سے پھیپھڑے ہی صاف ہو جائیں۔

ایک بار وہ نکلے بھی۔۔۔ اور تو اور اسی سنگیتا بھارتی نے کُوڑے کی ٹوکری ان کے سر پہ خالی کر دی۔

پیسے کو عورت چاہیئے، تو عورت کو بھی تو پیسہ چاہیئے۔

اس کے بعد مُکتی بودھ اندر ہی اندر، اور اندر اپنے آپ میں سمٹ گئے، جہاں انہیں اپنے ہی لہو کا سنگیت سنائی دینے لگا۔

ہیرالال ان کے پاس بیٹھا تھا، جب مُکتی بودھ نے اپنے مستک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جو یہاں لکھا ہے ہیرا، وہ مل کر رہے گا۔'' ہیرالال نے مُکتی بودھ کے ماتھے کی طرف دیکھا، جہاں چند بے ربط لکیروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ بائیں طرف ایک گھنڈی سی بنی تھی۔ شاید اسی نے قسمت کے بہاؤ کو روک لیا تھا۔ جبھی کُنڈلی دیکھنے والے پنڈت، مُکتی بودھ کے پاس سے اُٹھ کر چلے گئے۔

جیسے ان کا بھی سہارا چلے جانے پر انہوں نے جھلّا کر ہاتھ ہارمونیم پر مارا اور تھوڑی آ آ آ کے بعد ایک غزل شروع کر دی، جو پیلو میں باندھی گئی تھی۔

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو

مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

خشوع و خضوع کے آنسو مُکتی بودھ کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، جس نے ہیرا کے بھی بندھ کھول دیے۔ یہ وہ دن تھے جب نند لال کی 'اَمبِکا' ہٹ ہو گئی تھی۔ ہیرا نے جلد سے اپنے آنسو پونچھے۔

آئیڈیا۔

نند لال بری طرح سے پانچویں ورن میں گِھرا ہوا تھا، جب کہ ہیرا لال بڑی خامشی سے آ کر نیاز مندانہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ صاحب سلامت تو ہو ہی چکی تھی، مگر نند لال اسے آگے بڑھنے دینا نہ چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی گجُو، ڈانڈیکر، فیروز اور ان کی قبیل کے لوگوں سے گھبرایا ہوا تھا۔ جیسے ہر امیر آدمی کی بیماری میں ملاقاتی ڈاکٹر، حکیم اور وید بن جاتے ہیں، ایسے ہی سب لوگ اسے آئندہ کے لیے

مشورے دے رہے تھے۔ اگر ناکامی میں نند لال کچھ سوچ بھی سکتا تھا، تو اب کامیابی میں وہ بالکل کنفیوژ ہو گیا۔

نندلال جب دوسروں سے باتیں کر رہا تھا تو ہیرالال اپنی کمین گاہ سے نظریں اس پر فوکس کرنے لگا، جیسے وہ کسی مسمریزم، تانترک ودّیا کے گُر جاننے لگا ہو۔ احتیاج آدمی کو کیا کچھ نہیں سکھا دیتی؟

اُچٹ کر نند لال کی نظر جو ہیرا پر پڑی تو وہ اپنی نگاہیں ہٹا ہی نہ سکا۔ جیسے اس نو وارد میں کوئی خاص بات ہو۔

"کیا حال ہے؟" نندلال نے تکلفاً پوچھ ہی لیا۔

اپنی جگہ پر کسمساتے ہوئے ہیرا نے وہیں سے ڈوری پکڑ لی۔ "بس کِرپا ہے امبا جی کی۔"

نندلال چونک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے امباماں نے خاص طور پر اسے اس کے ہاں بھیجا ہے۔ امباماں، جس نے چھ لاکھ کے خرچ پر کروڑ لوٹائے۔ پھر وہ ڈر گیا۔ کہیں یہ بھی تو وہ نہیں ہے؟

مہینہ بھر ہیرا نے اپنا عندیہ نند لال سے چھپائے رکھا، جس سے نند لال میں ایک عجیب نفسیاتی اُلجھن پیدا ہو گئی۔ وہ اب تک لوگوں کی فرمائش اور اپنے انکار کا عادی ہو چکا تھا۔ ہیرا نے کام بھی پکڑا تو نند لال کے نئے دفتر کا۔ وہ پائی پائی پر انٹیریئر ڈیکوریٹر سے لڑتا۔ پچیس ہزار کے خرچ پر نند لال اسے پانچ ہزار ایڈوانس دینا چاہتا تھا، لیکن ہیرا لال نے اس کے ہاتھ روک لیے اور اسے پانچ سو میں نپٹا لیا۔ کچھ دن کے بعد پھر اسے ایک ہزار دے دیا۔ آخر سامان تو ہمیں ہی دینا ہے، اسے تو سب اپنے دماغ ہی سے نکالنا ہے نا۔ وہی دلیل جس کی وجہ سے کوئی فن کار اپنے پیشے سے روٹیاں نہیں نکال سکا۔ لیکھک کو ساتھ میں پیاز کی دکان ضرور کھولنی چاہیئے۔

اور ایسا ہوتا بھی ہے کہ جو آدمی پیسے کے لیے لٹکایا جاتا ہے، زیادہ تندہی سے کام کرتا ہے۔ پھر ہیرا نے سُدھا بھابی سے پُوجا کا معاملہ طے کیا۔ نند لال سُدھا کو ہمیشہ اِگنور کیا کرتا تھا۔ لیکن اب یہ ہیرا ہی کی وجہ سے تھا کہ سُدھا کو دفتر کے مہورت پر مُکھ رکھا گیا۔ پوجا میں تو وہ تھی ہی تھی، لیکن دوسری باتوں میں بھی سب سے آگے۔ اصل میں وہی دیوی تھی جس کے پاؤں کی خیرات سے نند لال

بنا۔ سینکڑوں لوگ نند لال کے لیے نہیں، 'امبکا' کی کامیابی کی خاطر آتے تھے۔ وہ پہلے سُدھا کو نمسکار کرتے تھے، جس سے اسے اپنا وجود ضروری، خوبصورت اور امبکا معلوم ہونے لگا تھا۔

ہیرا نے اس قدر خوبصورت طریقے سے نند لال کو گرگوں سے بچایا تو نند لال کے دل میں اس کے لیے عزّت بڑھ گئی۔ پھر آیا وہ آئیڈیا کا دن۔

دن ابھی شام میں ڈھل نہ پایا تھا کہ نند لال ہی کے گھر میں ہیرا نے عشاء کی نماز کی تیاری شروع کر دی۔ اس وقت وہ وضو کر رہا تھا، جب کہ نند لال چونکا۔ ”تم مسلمان ہو؟“

”نہیں تو۔“

”تو پھر۔ یہ؟“

”میں سیکھ رہا ہوں، نماز کیسے پڑھی جاتی ہے؟“

”وہ کس لیے؟“

”میں ایک مسلم سبجیکٹ بنا رہا ہوں، نند لال جی۔“ ہیرا نے کچھ رکتے ہوئے کہا۔

”دراصل میں اس کا ٹائیٹل امپا میں رجسٹرڈ کروا آیا ہوں۔“ اور اس نے جیب میں سے رسید نکالی۔ واقعی ٹائیٹل ہیرالال پنڈت کے نام رجسٹرڈ تھا، اور وہ تھا۔ سجدہ!

”ارے!“ ہیرانے ایک دم کہا، جیسے کوئی بھولی ہوئی بات ایک دم اسے یاد آ گئی اور جو پہلے ہی کوندے کی طرح سے لپک کر نندلال کے دماغ میں آ چکی تھی۔ اور اسی لیے منطبق ہو گئی۔

”یہ فلم آپ کو بنانی چاہیے۔ آپ جو کسی بات کا فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں، آج ہو گیا، فیصلہ! بات یہ ہے ’امبکا‘ بنانے کے بعد آپ نے پوری ہندو قوم کو رام کر لیا ہے۔ ’سجدہ‘ سے پوری مسلمان قوم کو رحیم کر سکتے ہیں۔“

”ہیرالال۔“

”جی، نندلال جی؟“

”ٹائیٹل۔“

”ٹائیٹل میرے نام ہے تو کیا ہوا؟ آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔“

”نہیں، میں سوچ رہا تھا۔ ٹائیٹل بہت دھانسو ہے۔“

جب ہی ہیرالال کو پتا چل گیا کہ وہ نشانے سے تھوڑا آگے ہی نکل گیا ہے۔ چنانچہ اس نے باتوں میں اُلجھائے رکھنے کی بات سوچی۔ یوں بھی دن بھر اِدھر اُدھر جھک مارنے سے نند لال کی مدافعت کی سب قوّتیں ختم ہو چکی تھیں۔ پھر اس وقت وہاں کوئی دوسرا تھا بھی نہیں۔ سُدھا بھابی جی کے ساتھ سازش کر کے اس نے آنے جانے والوں کے تانتے کو بکھیر دیا تھا۔ اس وقت وہ نند لال اور اس کے خدا یا دیوی کے بیچ 'اکیلے' تھے۔ ہیرا کہے جا رہا تھا۔ ”مسلمانوں کے اُٹھنے بیٹھنے، اُن کے کلچروں میں وہ بات ہے جو ہندوؤں کو بھی بہت پسند آتی ہے۔ دیکھو نا، بیٹی کیسے باپ کو آداب کہتی ہے اور ساتھ میں ابّا حضور بھی۔ سامنے آ کر بھی کتنا خوبصورت پردہ ہے، جو آج کے ننگے پن میں کہاں ہے؟“

”میں سمجھ گیا۔“

”نہیں، آپ نہیں سمجھے۔ مسلمان جو بھاشا استعمال کرتے ہیں، وہ کتنی سندر رہے۔ شکیلہ بانو بھوپالی جب قوّالی کرتی ہیں تو گجراتی ہندو بھی پاگلوں کی طرح سے داد دیتے ہیں، چاہے ایک لفظ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔“

”اس کی بات چھوڑو۔ وہ سب سمجھا دیتی ہے۔“

اس پر نند لال اور ہیرا دونوں مل کر ہنسے۔ انہوں نے دیکھا کہ سُدھا بھی کبارڈ کے پیچھے کھڑی ہنس رہی۔

پھر مشاعرے پر بات چلی آئی، جس کے سامنے کوی سمیلن کا رنگ نہیں جمتا۔

تو۔ ’امبکا‘ کے بعد ’سجدہ‘۔ بیچ میں نعت، قوّالی، مشاعرہ، کوٹھا، غزلیں، چوڑی دار مقیش لگے، لہراتے ہوئے دوپٹّے اور آخر۔ پیسہ۔

بات ہو چکی تھی، مگر نند لال کا قدرتی حربہ آڑے آرہا تھا، یعنی کہ سر کے جھٹکے۔ کبھی لگتا تھا فلم بنے گی، کبھی نہیں بنے گی، بنے گی، نہیں بنے گی۔

میوزک ڈائریکٹر کے طور پر مُکتی بودھ جی کا نام تجویز ہوا تھا، اس لیے کہ وہی ایک ایسے آدمی تھے، جو ہیرا لال کے پلے بیک سنگر بننے کے خواب پورے کر سکتے تھے۔ ہیرا نے نند لال کے سامنے اپنی بات ہی نہ کی، کیونکہ اندر سے وہ جانتا تھا کہ مُکتی بودھ آ جائیں گے تو وہ خود بھی آ جائے گا۔ اس کا چانس سینٹ پَر سینٹ ہے۔ نند لال کا اعتراض تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مُکتی بودھ ایسا سنگیت کار

انڈیا نے ابھی تک پیدا نہیں کیا، لیکن آج کل وہ بکتے نہیں۔ دوسرا، ہندو ہونے کے ناطے وہ نعت کیسے بنائیں گے؟

پلے بیک سنگر بھی چوٹی کا ہونا چاہیئے کیونکہ اردو بھاشا میں 'ک' دو طرح کے ہوتے ہیں، جن میں سے ایک گلے سے نکلتا ہے اور دوسرا۔۔۔ دوسرا نا معلوم کہاں سے؟ ایسے ہی 'سا'، آ، عرق، عشبہ، کو ٹھیک سے بولیں تو اَتار (عطار) کا لڑکا کہے گا۔ ہے تو میرے پاس، پر اتنا گاڑھا نہیں ہے۔ اور ہیرا کانپ گیا۔

لیکن جیسے تیسے اتنے بڑے آدمی کو، جس کی 'امبکا' ہِٹ ہو گئی تھی، مُکتی بودھ کے گھر لے ہی آیا۔ نند لال نے بڑی عقیدت سے ان کے چرن چھُوئے۔ مُکتی بودھ جی نے وہسکی اور دوسرے لوازمات کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جتنی دیر یہ سب لوگ پیتے پلاتے، پیتے کھاتے رہے، مُکتی بودھ مسلم کلچر ہی کی باتیں کرتے رہے۔ آخر طے ہوا کہ گورووار کے روز ان سے کانٹریکٹ کریں گے کیونکہ وہی دن دیوی ماں کا ہے۔ نند لال نے جاتے ہوئے بھی اتنے بڑے ماسٹر و کے پاؤں پر سر رکھا اور مُکتی جی کو یقین ہو گیا کہ اس دن ان کا کانٹریکٹ ہو ہی جائے گا۔ دونوں لال چلے گئے، پیچھے وہی دو ٹوٹرو رہ گئے، لیکن آج اس بُڑھیا سنگیتا نے اپنے

بُڈھے کے لیے گاجر کا حلوہ بنایا تھا۔

فلمی دنیا میں ہر خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ جہاں اتنے بڑے پروڈیوسر کی تصویر میں میوزک دینے کے لیے لوگ مُکتی بودھ کے پاس آنے لگے، وہاں قرض خواہ بھی جو مایوس ہو چکے تھے۔ مُکتی بودھ سب کو کہنے لگے۔ آپ گوروار کے روز آجایئے اور اپنا حساب لے جایئے۔ اور پھر، نہیں نہیں، گوروار نہیں۔ میرا خیال ہے اگلے منگل۔ بات یہ ہے نند لال چیک میں پیسے دے گا۔ وہ سنیچر کو بینک میں پڑیں گے اور آپ جانتے ہیں، اس دن کوئی کلیرنس نہیں ہوتی۔ سوموار کو چیک جائے گا اور منگل کی شام کو میرے بینک میں آئے گا۔ اس لیے بدھ ہی کو آئیں تو اچھا ہے۔ مُکتی بودھ حیران ہوئے کہ کسی کو ان کی یہ بات بری نہیں لگی۔

رات جب مُکتی بودھ سونے لگے تو ایک عجیب سی شکر گزاری کا جذبہ ان پر رینگنے لگا۔ آخر بھگوان نے سُن لی میری۔ دینا ناتھ شاستری، جیوتش آچاریہ تو کہتے بھی تھے کہ بس آپ کے ایسے دن آنے والے ہیں کہ آپ پہلے کے شِکھر سے بھی اوپر پہنچیں گے۔ ایک نہیں شاید آپ کو پانچ چھ کانٹریکٹ بھی ملیں۔ ہو سکتا ہے

راج دربار کی طرف سے مان بھی پراپت ہو۔ بس جب آپ کے چاند پر سے منگل گزر جائے گا تو پتنی کی طرف سے بھی چِنتا نہ رہے گی۔ اور گورُو کے مارگی ہوتے ہی لکشمی آپ کے گھر ڈیرا ڈال لے گی۔ پھر انہیں بیوی کا خیال آیا۔ وہ ہنسے۔ ایک گھر میں دو عورتیں کیسے رہ سکتی ہیں؟

سِٹی سول کورٹ سے ایک ٹانچ بھی مُکتی بودھ جی کے ہاں کی سب چیزوں پہ لگی تھی۔ جب لال برادران وہاں تھے، تو بُڑھیا نے کس صفائی سے سب چیزوں پر لگی ہوئی ٹانچ کی چیپیاں چھپادی تھیں۔ کسی پر میز پوش ڈال دیا تھا، کسی پر چادر۔ اگلے ہی روز بیلف وغیرہ کو کچھ دے دلا کر مُکتی بودھ جی نے سامان پر قبضہ اور نیلامی کی تاریخ اگلے ہفتے تک ملتوی کروالی تھی۔

گورووار کے دن بھی نند لال ہی کو مُکتی بودھ جی کے ہاں آنا تھا۔ پانچ بجے شام کا وقت تھا۔ جب چھ ساڑھے چھ ہوئے، تو ہیرا کی شکل دکھائی دی۔ اس نے بتایا کہ نند لال کو لیبارٹری میں 'امبکا' کے نئے پرنٹ بنوانا تھے، اس لیے دیر ہو گئی۔ بات یہ ہے، کہ اس فلم 'امبکا' کے ڈیڑھ سو پرنٹ بنوائے اور نیگیٹو گھِس گیا۔ اس لیے ہم ایک پرنٹ سے ڈیوپ نکال کر اس سے کاپیاں بنوائیں گے۔ ڈویلپ سے جو

پرنٹ نکلا ہے، انکل، اس کے مقابلے میں پہلا پرنٹ بھی کچھ نہیں۔ آپ میری خاطر اس کوتاہی کو بھول جائیے۔ آپ میری مدد تو کر ہی رہے ہیں، تھوڑی اور کر دیجیے اور وہ یہ کہ آپ نندلال جی کے گھر ہی چلے چلیں۔ آناکانی کا کوئی بہانہ ہی نہ رہے۔ دیکھیے آپ کی عزّت میری عزّت ہے، اور میری عزّت تو کچھ ہے ہی نہیں۔ آخر وہ اتنا بڑا اور کامیاب پروڈیوسر ہو کر آپ کے گھر آیا ہی تھا نا۔ آپ کے چرن بھی چھوئے ہی تھے نا۔

مُکتی بودھ جی شاید کچھ سوچتے مگر بڑھیا نے انہیں کوئی موقع ہی نہ دیا۔ تسلا، جس میں چاول رکھتے تھے، اسے خالی دکھا دیا۔ مُکتی بودھ اُٹھے اور ہیرا کے ساتھ چل دیے۔ جب ہیرا کہہ رہا تھا، میرے پلے بیک کی بات ابھی نہیں، بعد میں کیجیے گا، جب آپ کا کانٹریکٹ ہو جائے۔

لاطور بھون میں نندلال کی بیوی سُدھا نے ان کی خاطر وغیرہ کی۔ دس بجے تک زندگی کے یہ دو کنارے آپس میں اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے۔ پھر گیارہ بج گئے، بارہ اور خون مُکتی بودھ کے سر کو آنے لگا۔ میں نے غلط کیا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ کبھی ایک جھوٹ میں سے دس سچ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر، نندلال آخر انسان

ہے اور انسان سے مصروفیت ہو ہی جاتی ہے۔ نند لال کو اب لے ہی آؤ، پرماتما، نہیں موت کا بیلف کیسے ٹلے گا؟

نند لال اپنی اسی گھچ گھچ کرتی مگر لگی گاڑی میں اس وقت، یعنی کہ رات کے ایک بجے آیا جب کہ مُکتی بودھ ایسی تیسی کہہ کر چلنے ہی والے تھے۔ نند لال لنگڑا رہا تھا۔ پتا چلا اچانک پیچش ہو جانے سے اسے ڈاکٹر کے پاس جا کر سرین کے اوپر ٹیکے لگوانے پڑے جو ابھی درد کر رہے تھے۔ شکروار دیوی ماں کا دن ہے، نند لال نے بتایا، اور اس روز وہ برت رکھتے ہیں۔ صبح سے کچھ کھایا ہی نہیں۔ مُکتی بودھ نے کہا۔ پہلے کھاؤ، پھر بات کریں گے۔ آخر انسان اتنی دوڑ دھوپ کرتا کس لیے ہے؟ بہُو! چاول میں دہی زیادہ دینا ذرا، اور مُکتی بودھ نے کسی اضطرار میں اپنا ہاتھ پیٹ پر رکھ لیا اور اسے سہلانے لگے۔

ہیرا اور مُکتی بودھ ٹیرس پر بیٹھے تھے، جہاں ان پر اوس پڑ رہی تھی۔ "یہاں اوس پڑ رہی ہے، انکل!" ہیرا لال نے کہا، "اندر نہ چلے جائیں؟"

مُکتی بودھ بولے۔ "نہیں بیٹا، اس کا تو کچھ نہیں، وہ ہماری امیدوں پر نہ پڑے، بس۔" اور پھر وہ کھسیانہ سی ہنسی ہنس دیے۔

سب کچھ ہو جانے کے بعد نند لال آیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مکتی بودھ سے معافی مانگی، اس لیے نہیں کہ وہ لیٹ ہو گیا تھا، بلکہ پیسے لیٹ ہو گئے تھے، "ابھی تک تو بندوبست نہیں ہوا مگر بدھ تک ضرور ہو جائے گا۔"

جانے مکتی بودھ جی نے کیسے کہہ دیا۔ "کوئی بات نہیں، بیٹا! بدھ کون سا دور ہے؟" حالاں کہ ان کے دماغ میں دلال، سیٹھیے، بیلف کیا کچھ گھومنے لگا تھا، اور ان سے زیادہ اپنی بڑھیا جو گھوم ہی نہیں رہی تھی۔

باقی ذمے داری ہیرا کی تھی کہ وہ بڑھؤ کو سمجھا دے کہ پیسہ کوئی آسانی سے ڈھیلا نہیں کرتا۔ 'امبکا' میں کروڑ کا بزنس ٹھیک ہے، لیکن وصولی بھی تو کوئی چیز ہے؟ پچیس ہزار تو دفتر کی انٹیریئر ڈیکوریشن میں لگ گیا ہے۔ ارے صاحب، ڈسٹری بیوٹر اور پیسہ دیں؟ کیا کیا جھوٹے واؤچر اور حساب نہیں بناتے؟ شہر شہر گاؤں گاؤں جا کر چیکنگ کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لیے ایجنٹ رکھیں تو اسے پانچ سو ہزار سے کیا کم دیں گے؟ اگر ڈسٹری بیوٹر اس کی جیب میں پانچ ہزار ڈال دے، ساتھ شراب پلائے اور کوٹھے پر گانا سننے کے لیے لے جائے، تو بتایئے وہ ایجنٹ آپ کا ہوا یا ڈسٹری بیوٹر کا؟ ایمان داری نام کی یہاں کوئی چیز ہی نہیں۔ ایک ہی ایمان

دار ایجنٹ ملا تھا، چیکنگ کے ایک ہفتے کے اندر جس کی لاش ٹائلٹ سے ملی۔

خیر، ہیرا کیسا بھی تھا، مگر تھا تو مُکتی بودھ جی ہی کا بہی خواہ۔ ساتھ نند لال کا بھی۔ حالاں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اصل میں وہ اپنا ہی خیر خواہ تھا۔

لاطور بھون کے ٹیرس سے اٹھ کر چلتے ہوئے مُکتی بودھ جی نے صرف اتنا ہی کہا۔ ''یہ کاہے کی بیل ہے؟''

''مارننگ گلوری کی۔'' نند لال نے جواب دیا۔

مکتی بودھ جی نے اپنی نظریں بچاتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر ایوننگ گلوری کی بھی کوئی ہو گی؟'' اور پھر وہ ہنس دیے، چل دیے۔

ہیرا میں باقی تو سب ٹھیک تھا، لیکن ایک بات غلط تھی۔ اس نے مُکتی بودھ جی کی پوری رقم اور سائننگ اماؤنٹ بھی خود ہی طے کر دی تھی۔ جیسے وہ، مُکتی جی، کوئی بات ہی نہیں۔ ظالم! پوچھ تو لیا ہوتا؟ فلم میں جو آتا ہے، رشتے جگا لیتا ہے۔ ارے بھائی، ہمیں اپنا بیٹا نہیں بیاہنا ہے۔ یہ کمرشل دنیا ہے، اس ہاتھ سے کام لو، اس ہاتھ سے دام دو اور بس۔ اس سے پہلے یہ بکواس کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہوئی بھی تو ہم

نے کانٹریکٹ پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ اور اب، وہ جگر اب میں کہاں سے لاؤں؟ یہ ہیرا؟ کہتا ہے میں نے نند لال کو کہہ بھی دیا کہ انکل کا تو کچھ نہیں، وہ درویش آدمی۔ ارے درویش کو کیا حاجت نہیں ہوتی؟ پھر، فلمی دنیا گروپ سے چلتی ہے۔ آپ ایک بار اس گروپ میں گھس تو جایئے، انکل! 'امبکا' گروپ۔ آج کے سب سے بڑے اور کامیاب پروڈیوسر نند لال کا گروپ۔ ارے، بڑے نند لال آئے اور بڑے گئے۔ اس کے ذریعے آپ کو دس تصویریں ملیں گی۔ ارے۔ تیے، مجھے اسی ایک کی ضرورت ہے، بعد کی دس اور بیس کی نہیں۔ کبھی میرا بھی وقت تھا، جب تمہارے ایسے آدمی کو ہفتہ ہفتہ باہر بٹھائے رکھتا تھا۔ کہیں غلطی سے وہ اپنا تھوبڑا میرے کمرے میں لے تو آئے، میں چِلّا کر کہتا تھا۔ گیٹ آؤٹ۔ گیٹ۔ آؤٹ۔

اور اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے مُکتی بودھ سچ مچ چِلّا اٹھے۔ گیٹ آؤٹ۔۔۔

بُڑھیا بڑبڑا کے اٹھی۔ "کیا ہوا؟"

مُکتی بودھ کی سانس دھونکنی کی طرح سے چل رہی تھی۔ وہ ماتھے پر سے انفعال کے قطرے پونچھ رہے تھے۔

”وہی ہو رہا ہے، جو تیرے ایسے کھوسٹ کا ہونا تھا۔“ بڑھیا نے کہا اور واپس اپنے بوڑھے بستر پر لیٹ گئی۔

جس دلیری سے تقاضا کرنے والوں کو مُکتی بودھ جی نے بدھ کا وقت دیا تھا، اسی بے حیائی سے اگلے سنیچر کا دے دیا (چیک بدھ کو بینک میں پڑے گا، تو۔ وغیرہ) حیرانی کی بات یہ کہ بیسیوں ہی آئے مگر ٹالے جانے پر کسی نے اف بھی نہ کی۔ کیا ارادے تھے ان کے؟ وہ شور مچاتے، نالش کی دھمکی دیتے، مگر یہ چُپ! رام جانے یہ سب مل کر کیا کرنے والے ہیں؟مُکتی بودھ کانپ رہے تھے۔

بدھ کے روز موعودہ وقت پر ہیرانند لال کی پتنی سُدھا کے ساتھ چلا آیا۔ سُدھا کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبّہ تھا جو اس نے مُکتی بودھ جی کے آگے رکھ دیا۔ ”منہ میٹھا کیجیے، انکل۔“مُکتی بودھ اور ان کی بڑھیا نے ڈبّہ لے لیا اور انتظار کرنے لگے۔

ہیرا بولا، ”میں آپ کے گھر میں ان لکشمی کو لے آیا ہوں۔“ اور اس نے سُدھا بھابی کی طرف اشارہ کیا۔ سُدھا بھابی سے بڑی لکشمی کیا ہو گی؟ بات یہ ہوئی کہ نند لال اووَر فلو لینے کے لیے کلکتہ چلے گئے ہیں۔ ہفتہ بھر میں لوٹ آئیں گے۔ جاتے سمے انہوں نے تاکید کی کہ مُکتی بودھ جی کو میرا اچانک چل دینا برا نہ لگے، اس

لیے تم میری بیوی کو لے جانا اور ساتھ برج واسی کے ہاں سے رس ملائی کا ایک ڈبّہ بھی۔ اپنی عورت سے بڑی آدمی کی عزّت کیا ہوتی ہے؟ مُکتی بودھ جی نے سر ہلایا اور بولے۔ ہوں، اور ایک نظر اپنی بڑھیا کی طرف دیکھا۔ ان میں پرانے جلال کے دن پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

ادھر ہیرا اور سُدھا گئے، ادھر ٹانچ والے گھر سے ریڈیو گرام، اسپیکر، ٹیپ ریکارڈ، ہارمونیم، سِتار، فرنیچر اور کچھ برتن اٹھا کر لے گئے۔ اس کا کیا ہے، مُکتی بودھ جی نے سوچا، دس دن میں پیسے آ جائیں گے تو چیزیں بھی لوٹ آئیں گی، جب تک انہوں نے نیلام نہ کر دی ہوں تو۔ کر بھی دی ہوں تو نئی خریدیں گے۔ آخر ایک آدمی نے اپنی عورت، اپنی عزّت میرے گھر بھیجی ہے۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہو گی؟ یہ کوئی آزمائش ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے دس دن میں نند لال کلکتہ سے لوٹ ہی آئے۔

جب ٹانچ والوں نے گھر کی چیزوں پر ہاتھ ڈالا تو مُکتی بودھ کی بڑھیا نے ایک دلدوز چیخ ماری اور اس کے بعد بے ہوش ہو گئی۔ یہ اچھا ہی ہوا، اگر وہ ہوش میں ہوتی تو دوسروں کے ہوش ٹھکانے کر دیتی۔ وہ مغلظّات سناتی کہ بس۔

دس دن بیت گئے لیکن نند لال کلکتہ سے نہ لوٹا۔ اب ہیرا مکتی بودھ جی سے بچتا پھر رہا تھا۔ نند لال کا ہاتھ روکنے اور مکتی بودھ کو پیسہ دلوانے کے بیچ میں وہ کہیں بٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے اپنا آدرش دور ہٹتا، خود میں کہیں گُم ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ نند لال کہیں اس سے بھی کھیل تو نہیں کر گیا؟ نہیں وہ ایسا آدمی تو نہیں ہے۔ ہیرا نے ایک بار مکتی بودھ کو مل کر بتایا کہ اوور فلو جھگڑے میں پڑ گیا ہے۔ اسی لیے نند لال نہیں آیا، مگر آئے گا ضرور، کچھ دن میں۔ کہاں جائے گا؟

مکتی بودھ جی ہیرا کی بات پر ہونٹ بھینچ کر صرف ایک ہی بات کہتے رہے، ”ہوں!“ لیکن جب ہیرا چلا جاتا تو اپنے آپ سے کہتے۔ ”مکتی! تجھے کیا ہو گیا ہے، کیوں نہیں تو ان پِلّوں کو ٹھڈے مار کر باہر نکال سکتا؟ اب رہ ہی کیا گیا ہے؟“

اسی سلسلے میں ایک دن مکتی بودھ جی نے دُلارے، اپنے شاگرد کو بھیج کر استاد کلب علی کا سِتار منگوایا، جس پر ہاتھ رکھتے ہی وہ سب کچھ بھول گئے۔ بجاتے ہوئے کیسے وہ اس ساز سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا، جیسے ان کے بازوؤں میں کوئی محبوبہ ہے، جس پر جھُک جھُک کر، جِسے چوم چوم کر، جس پر انگلیاں دوڑا دوڑا کر، وہ کسی نئی زندگی کے سُر نکال رہے ہیں۔ بُڑھیا دیکھ رہی تھی

اور کباب ہو رہی تھی۔ یہاں کی عورت، وہاں کی عورت کی ہمیشہ حاسد رہی ہے۔ یہ کہ اسے اپنی ذات میں کھو کر، اپنے مالک میں مدغم ہو کر اس کی ملکہ ہو جانا چاہیے، سب باتیں ہیں۔ وہ تو اپنے میاں کی ہر دل عزیزی سے بھی جل بھن کر راکھ ہو جاتی ہے۔

ایک جھالے کے بعد یک دم مکتی بودھ جی نے سِتار ایک طرف رکھ دیا اور پھر وہی اپنے آپ پر رحم۔ اس پر بھی تو یہ سب اپنے آپ سے ہوتے دیکھ رہا ہے مکتی۔ کیوں نہیں تو نند لالوں سے کہہ سکتا۔ نہیں چاہیے مجھے تمہارا 'سجدہ' جو سجدہ ہی نہیں۔ پھر انہیں رستم کے آخری دن یاد آ جاتے، جن میں وہ روتا اور سر اُوپر اٹھا کر، ہاتھ پھیلا کر کہتا۔۔۔ اللہ! کہاں گئے وہ میرے دن، جب میں چلتا تھا تو میرے پاؤں زمین میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ اور آج؟

پھر وہ نعت، جس کی دُھن اپنی بے کاری کے دنوں میں مکتی جی نے نکالی تھی، جسے گاتے ہوئے انہوں نے بیچ میں سب بند کر دیا۔ یہ بھیرویں، یہ ٹوڈی۔ کیا میاں کی اور کیا بیوی کی اور کیا کھماچ سب بکواس ہیں۔ قرآن کی بھی تو آیت ہے، جس رُخ زمانہ پھِرے، اسی رُخ پھِر جاؤ۔ میں نہیں پھِر سکتا، میری ہڈیاں بوڑھی ہو گئی

ہیں، جو ٹوٹ سکتی ہیں، مڑ نہیں سکتیں۔

نہیں! میں یہ نہیں کروں گا۔ میں نہیں مرغِ باد گرد۔ میں نے اپنے سنگیت، اپنی ماں سے پیار کیا ہے، ایشور! عورتیں بیسیوں، سیکڑوں ہو سکتی ہیں، ماں صرف ایک۔ کیا میں بھوکا بھی نہیں مر سکتا؟ یہ آزادی مجھ سے کوئی نہیں، کوئی نہیں چھین سکتا۔

نند لال دس دن بعد بھی نہ لوٹا، بیچ میں ہیر المکتی بودھ جی کے گھر کا طواف کرتا رہا۔ مگر ان کا دروازہ کھٹکھٹانے، اندر جانے کی اس کی ہمّت نہ پڑی۔ شاید وہ مکتی بودھ جی سے اتنا نہ ڈرتا تھا، جتنا ان کی بُڑھیا سے۔

اب کے جو ہیرا آیا تو ایک تار سے مسلح۔ تار کلکتہ سے آیا تھا، جس میں لوٹنے کا تِتھ وار سبھی لکھے تھے۔ اس دستاویز کو کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر مکتی بودھ پھر کچھ بھول گئے۔ اور آنکھیں سکوڑ کر کہیں دور دیکھتے ہوئے بولے۔۔۔
''ہُوں۔''

ہیرا اندر سے جانتا تھا کہ اگر مجھے مکتی بودھ جی کی ضرورت ہے تو انہیں بھی میری،

اور نند لال کی۔ مقررہ تاریخ کو نند لال واقعی چلا آیا۔ ہیرا اسے گھیر گھار کر مکتی جی کے ہاں لے بھی آیا۔ کیا تیقن سے اس کے ہاتھ گھنٹی پر پڑے۔ بہت دیر تک اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ آخر پتا چلا کوئی آ رہا ہے۔ دروازہ کھلا تو سامنے بڑھیا تھی، جو انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کانچ تھا۔ سارے چہرے پر پرچھائیاں پھیلی تھیں اور جھریوں میں کوئی سِلٹ جمی تھی، جیسے طوفان اور باڑھ کے بعد چھوٹے بڑے ندی نالوں میں جم جاتی ہے۔

بڑھیا نے ان کو جانے کے لیے کہا، نہ بیٹھنے کے لیے۔ اس پر بھی وہ اندر جا کر بیٹھ گئے۔

ہیرا نے پوچھا، ”انکل کہاں ہیں آنٹی؟“

پہلے تو وہ ایسے ہی بڑ بڑ دیکھتی رہی۔ آخر بولی، ”جانے کہاں کھپ گیا ہے، بڑھؤ۔ اسے تو موت بھی نہیں آتی۔ کیا کیا ٹونے نہ کیے میں نے۔“

تین گھنٹے انتظار کے بعد نند لال چیک سمیت لوٹ گئے۔ ہیرا نے اور کوئی دیر دیکھ لینے کو کہا، مگر نند لال راضی نہ ہوا۔ اٹھتے ہوئے نند لال نے تسلّی کے لیے جیب

میں ہاتھ ڈال کر دیکھا، چیک وہیں تھا! ہیرا کی حالت ابتر تھی۔ البتّہ اتنی محنت سے بنائی ہوئی اس کی عمارت ڈھے گئی تھی۔ جس ٹھیکے دار کو اسے بننے کے لیے دیا تھا، اس نے سیمنٹ سے زیادہ ریت اس میں ملا دی تھی۔

ہیرا گُم صُم جا رہا تھا کہ دور سے اس کے کان میں کوئی دُھن سنائی دینے لگی۔ جو پیلو میں بندھی تھی۔

ہیرا نے نند لال سے پوچھا، ”آپ کو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس اینٹوپ ہل کے پیچھے سے جہاں عرب ساگر ہے؟“

نند لال نے سننے کی کوشش کی اور بولا،

”نہیں تو۔۔۔ہاں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔“

ایک باپ بکاؤ ہے

کبھی نہ سنی یہ بات جو ۲۴ فروری کے ''ٹائمز'' میں چھپی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اخبار والوں نے چھاپ کیسے دی۔ خرید و فروخت کے کالم میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ہی اشتہار تھا۔ جس نے وہ اشتہار دیا تھا، ارادہ یا اس کے بغیر اسے معمّے کی ایک شکل دے دی تھی۔ پتے کے سوا اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی، جس سے خریدنے والے کو کوئی دل چسپی ہو۔ ''بکاؤ ہے ایک باپ۔ عمر اکہتّر سال، بدن اکہرا، رنگ گندمی، دمے کا مریض۔ حوالہ باکس نمبر ایل ۵۷۶، معرفت

'ٹائمز'۔"

"اکہتّر برس کی عمر میں باپ کہاں رہا۔۔۔ دادا نانا ہو گیا وہ تو؟"

"عمر بھر آدمی ہاں ہاں کرتا رہتا ہے، آخر میں نانا ہو جاتا ہے۔"

"باپ خرید لائے تو ماں کیا کہے گی، جو بیوہ ہے۔ عجیب بات ہے نا، ایسے ماں باپ جو میاں بیوی نہ ہوں۔"

"ایک آدمی نے الٹے پاؤں دنیا کا سفر شروع کر دیا ہے۔ آج کی دنیا میں سب سچ ہے بھائی سب سچ ہے۔"

"دمہ پھیلائے گا۔"

"نہیں بے۔۔۔ دمہ متعدّی بیماری نہیں۔"

"ہے۔"

"نہیں۔"

"ہے۔"

ان دو آدمیوں میں چاقو چل گئے۔۔۔جو بھی اس اشتہار کو پڑھتے تھے، بُڈّھے کی سنک پہ ہنس دیتے تھے۔ پڑھنے کے بعد اسے ایک طرف رکھ دیتے اور پھر اُٹھا کر اسے پڑھنے لگتے، جیسے ہی انہیں اپنا آپ احمق معلوم ہونے لگتا، وہ اس اشتہار کو اڑوسیوں پڑوسیوں کی ناک تلے ٹھونس دیتے۔

"ایک بات ہے۔ گھر میں چوری نہیں ہو گی۔"

"کیسے؟"

"ہاں، کوئی رات بھر کھانستا رہے۔"

"یہ سب سازش ہے، خواب آور گولیاں بیچنے والوں کی پھر۔۔۔ ایک باپ بکاؤ ہے۔"

یوں لوگ ہنستے ہنستے رونے کے قریب پہنچ گئے۔

گھروں میں، راستوں پر، دفتروں میں بات ڈاک ہونے لگی، جس سے وہ اشتہار اور بھی مشتہر ہو گیا۔

جنوری فروری کے مہینے بالعموم پت جھڑ کے ہوتے ہیں۔ ایک ایک داروغہ کے

نیچے بیس بیس جھاڑو دینے والے، سڑکوں پر ِگرے سوکھے سڑے، بوڑھے پتّے اُٹھاتے اُٹھاتے تھک جاتے ہیں، جنہیں ان کو گھر لے جانے کی بھی اجازت نہیں کہ انہیں جلائیں اور سردی سے خود اور اپنے بال بچّوں کو بچائیں۔ اس پت جھڑ اور سردی کے موسم میں وہ اشتہار گرمی پیدا کرنے لگا، جو آہستہ آہستہ سینک میں بدل گئی۔

”کوئی بات تو ہو گی؟“

”ہو سکتا ہے، پیسے جائیداد والا۔“

”بکواس۔۔۔ ایسے میں بکاؤ لکھتا؟“

”مشکل سے اپنے باپ سے خلاصی پائی ہے۔ باپ کیا تھا، چنگیز ہلاکو تھا سالا۔“

”تم نے پڑھا، مسز گو سوامی؟“

”دھت۔۔۔ ہم بچّے پالیں گی، سُدھا، کہ باپ؟ ایک اپنے ہی وہ کم نہیں گو۔۔۔ سوامی ہے! ہی۔ ہی ہی۔“

”باپ بھی حرامی ہوتے ہیں۔“

باکس ایل ۷۶ ۴ میں چٹھیوں کا طومار آیا پڑا تھا۔ اس میں ایک ایسی چٹھّی بھی چلی آئی تھی، جس میں کیرل کی کسی لڑکی مِس اونی کرشنن نے لکھا تھا کہ، وہ ابو دھابی میں ایک نرس کا کام کرتی رہی ہے اور اس کے ایک بچّہ ہے۔ وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ شادی کی متمنّی ہے جس کی آمدنی معقول ہو اور جو اس کی اور بچّے کی مناسب دیکھ بھال کر سکے، چاہے وہ کتنی عمر کا ہو۔ اس کا کوئی شوہر ہو گا، جس نے اسے چھوڑ دیا۔ یا ویسے ابو دھابی کے کسی شیخ نے اسے اُلٹا پلٹا دیا۔ چنانچہ غیر متعلّق ہونے کی وجہ سے وہ عرضی ایک طرف رکھ دی گئی، کیوں کہ اس کا بکاؤ باپ سے کوئی تعلّق نہ تھا۔ بہر حال ان چٹھیوں سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہیڈلے چیز، رابن سن، اروِنگ اور اگاتھا کرسٹی کے سب پڑھنے والے ادھر پلٹ پڑے ہیں۔ کلاسیفائیڈ اشتہار چھاپنے والوں نے جنرل منیجر کو تجویز پیش کی کہ اشتہاروں کے نرخ بڑھا دیے جائیں۔ مگر نوجوان بُڈّھے یا بُڈّھے نوجوان منیجر نے تجویز کو پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا۔۔۔Shucks ۔۔۔ایک پاپولر اشتہار کی وجہ سے نرخ کیسے بڑھا دیں؟ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پولیس پہنچی۔ اس نے دیکھا ہندو کالونی، دادر میں گاندھر وداس، جس نے اشتہار دیا تھا، موجود ہے اور صاف کہتا ہے کہ میں بِکنا چاہتا ہوں۔ اگر اس میں کوئی قانونی رنجش ہے تو بتایئے۔ وہ پان پہ پان چباتا اور اِدھر اُدھر دیواروں پر تھوکتا جا رہا تھا۔ مزید تفتیش سے پتا چلا کہ گاندھر وداس ایک گائیک تھا، کسی زمانے میں جس کی گائیکی کی بڑی دھوم تھی۔ برسوں پہلے اس کی بیوی کی موت ہو گئی، جس کے ساتھ اس کی ایک منٹ نہ پٹتی تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک اوندھی محبت میں بندھے ایک دوسرے کو چھوڑتے بھی نہ تھے۔ شام کو گاندھر وداس کا ٹھیک آٹھ بجے گھر پہنچنا ضروری تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی لین دین نہ رہ جانے کے باوجود یہ احساس ضروری تھا کہ وہ ہے۔ گاندھر وداس کی تان اُڑتی ہی صرف اس لیے تھی کہ دمینتی، اس کے سنگیت سے بھرپور نفرت کرنے والی بیوی گھر میں موجود ہے اور اندر کہیں گاجر کا حلوا بنا رہی ہے اور دمینتی کے لیے یہ احساس تسلّی بخش تھا، کہ اس کا مرد جو برسوں سے اُسے نہیں بلاتا، ساتھ کے بستر پر پڑا شراب میں بدمست خرّاٹے لے رہا ہے۔ کیوں کہ خرّاٹا ہی ایک موسیقی تھی، جسے گاندھر وکی بیوی سمجھ پائی تھی۔

بیوی کے چلے جانے کے بعد، گاندھر وداس کو بیوی کی تو سب زیادتیاں بھول گئیں، لیکن اپنے اس پر کیے ہوئے اتیّاچار یاد رہ گئے۔ وہ بیچ رات کے ایکا ایکی اٹھ جاتا اور گریبان پھاڑ کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگتا۔ بیوی کے بارے میں آخری خواب میں اس نے دیکھا کہ دوسری عورت، کو دیکھتے ہی اس کی بیوی نے واویلا مچا دیا ہے اور روتی چلّاتی ہوئی گھر سے بھاگ نکلی ہے۔ گاندھر وداس پیچھے دوڑا۔ لکڑی کی سیڑھی کے نیچے کچّی زمین میں دمینتی نے اپنے آپ کو دفن کر لیا۔ مگر مٹّی ہل رہی تھی اور اس میں دراڑیں سی چلی آئی تھیں، جس کا مطلب تھا کہ ابھی اس میں سانس باقی ہے۔ حواس باختگی میں گاندھر وداس نے اپنی عورت کو مٹّی کے نیچے سے نکالا تو دیکھا، اس کے، بیوی کے دونوں بازو غائب تھے۔ ناف سے نیچے بدن نہیں تھا۔ اس پر بھی وہ اپنے ٹھنٹ، اپنے پتی کی گردن میں ڈالے اس سے چمٹ گئی اور گاندھر واسی پُتلے سے پیار کرتا ہوا اسے سیڑھیوں سے اُوپر لے آیا۔

گاندھر وداس کا گانا بند ہو گیا۔

گاندھر وداس کے تین بچّے تھے۔ تھے کیا، ہیں۔ سب سے بڑا ایک نامی پلے بیک سنگر ہے، جس کے لانگ پلیئنگ ریکارڈ بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتے

ہیں۔ ایرانی ریستورانوں میں رکھے ہوئے جیُوک باکسوں سے جتنی فرمائشیں اس کے گانوں کی ہوتی ہیں، اور کسی کی نہیں۔ اس کے برعکس گاندھرو داس کے کلاسیکی میوزک کو کوئی گھاس بھی نہ ڈالتا تھا۔ دوسرا لڑکا آفسٹ پرنٹر ہے اور جست کی پلیٹیں بھی بناتا ہے۔ پریس سے وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ مہینہ پاتا ہے اور اپنی اطالوی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ کوئی جیے یا مرے، اسے اس بات کا خیال ہی نہیں۔ جس زمانے میں گاندھرو داس کا موسیقی کے ساز بیچنے کا کام ٹھپ ہوا، تو بیٹا بھی ساتھ تھا۔ گاندھرو نے کہا، "چلو، ایچ۔ ایم۔ وی کے ریکارڈوں کی ایجنسی لیتے ہیں۔"

چھوٹے نے جواب دیا۔۔۔ "ہاں، مگر آپ کے ساتھ میرا کیا مستقبل ہے؟"

گاندھرو داس کو دھچکا سا لگا۔ وہ بیٹے کا مستقبل کیا بتا سکتا تھا؟ کوئی کسی کا مستقبل کیا بتا سکتا ہے؟ گاندھرو کا مطلب تھا کہ میں کھاتا ہوں تو تم بھی کھاؤ۔ میں بھوکا مرتا ہوں تو تم بھی مرو۔ تم جوان ہو، تم میں حالات سے لڑنے کی طاقت زیادہ ہے۔ اس کے جواب کے بعد گاندھرو داس ہمیشہ کے لیے چُپ ہو گیا۔ رہی بیٹی تو وہ ایک اچھے مارواڑی گھر میں بیاہی گئی۔ جب وہ تینوں بہن بھائی ملتے تو اپنے باپ کو

رنڈوا نہیں، مرد بِدھوا کہتے اور اپنی اس اختراع پہ خود ہی ہنسنے لگتے۔

ایسا کیوں؟

چاترک، ایک شاعر اور اکاؤنٹنٹ، جو اس اشتہار کے سلسلے میں گاندھر وداس کے ہاں گیا تھا، کہہ رہا تھا۔۔۔ "اس بُڈّھے میں ضرور کوئی خرابی ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین اولاد میں سے ایک بھی اس کی دیکھ ریکھ نہ کرے۔ کیا وہ ایک دوسرے کے اتنے نزدیک تھے کہ دور ہو گئے؟"

ہندسوں میں اُلجھے رہنے کی وجہ سے کہیں چاترک کے الہام اور الفاظ کے درمیان فساد پیدا ہو گیا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ ہندستان تو کیا، دنیا بھر میں کنبے کا تصوّر ٹوٹتا جا رہا ہے۔ بڑوں کا ادب ایک فیوڈل بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اس لیے سب بُڈّھے کسی ہائیڈ پارک میں بیٹھے، امتدادِ زمانہ کی سردی سے ٹھٹھرے ہوئے، ہر آنے جانے والے کو شکار کرتے ہیں، کہ شاید ان سے کوئی بات کرے۔ وہ یہودی ہیں، جنھیں کوئی ہٹلر ایک ایک کر کے گیس چیمبر میں دھکیلتا جا رہا ہے، مگر دھکیلنے سے پہلے زنبور کے ساتھ اس کے دانت نکال لیتا ہے، جن پر سونا مڑھا ہے۔ اگر کوئی بچ گیا ہے تو کوئی بھانجا بھتیجا اتّفاقیہ طور پر اس بُڈّھے کو دیکھنے کے لیے اس کے

مخروطی ایٹک میں پہنچ جاتا ہے، تو دیکھتا ہے کہ وہ تو مرا پڑا ہے اور اس کی فلزاتی آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہیں۔ نیچے کی منزل والے بدستور اپنا اخبار بیچنے کا کاروبار کر رہے ہیں، کیوں کہ دنیا میں روز کوئی نہ کوئی واقعہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ڈاکٹر آ کر تصدیق کرتا ہے کہ بُڈّھے کو مرے ہوئے پندرہ دن ہو گئے۔ صرف سردی کی وجہ سے لاش گلی سڑی نہیں۔ پھر وہ بھانجا یا بھتیجا کمیٹی کو خبر کر کے منظر سے ٹل جاتا ہے، مبادا آخری رسوم کے اخراجات اسے دینے پڑیں۔

چاترک نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، بُڈّھے نے کوئی اندوختہ رکھنے کے بجائے اپنا سب کچھ بچّوں ہی پر لٹا دیا ہو۔'' اندوختہ ہی ایک بولی ہے، جسے دنیا کے لوگ سمجھتے ہیں اور ان سے زیادہ اپنے سگے سمبندھی، اپنے ہی بچّے بالے۔ کوئی سنگیت میں تارے توڑ لائے، نقّاشی میں کمال دکھا جائے، اس سے انھیں کوئی مطلب نہیں۔ پھر اولاد ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ اس کا باپ وہی کرے جس سے وہ، اولاد خوش ہو۔ باپ کی خوشی کس بات میں ہے، اس کی کوئی بات ہی نہیں اور ہمیشہ ناخوش رہنے کے لیے اپنے، کوئی سا بھی بیگانہ بہانہ تراش لیتے ہیں۔

مگر گاندھرو داس تو بڑا ہنس مکھ آدمی ہے۔ ہر وقت لطیفے سناتا، خود ہنستا اور

دوسروں کو ہنساتا رہتا ہے۔ اس کے لطیفے اکثر فحش ہوتے ہیں۔ شاید وہ کوئی نقاب، مکھوٹے ہیں، جن کے پیچھے وہ اپنی جنسی ناکامیوں اور ناآسودگیوں کو چھپاتا رہتا ہے۔ یا پھر، سیدھی سی بات۔ بڑھاپے میں انسان ویسے ہی ٹھرکی ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقی یا مفروضہ فتوحات کی بازگشت۔۔۔

اشتہار کے سلسلے میں آنے والے کچھ لوگ اس لیے بھی بدک گئے کہ گاندھرو داس پر پچپن ہزار کا قرض بھی تھا، جو بات اس نے اشتہار میں نہیں لکھی تھی اور غالباً اس کی عیّاری کا ثبوت تھی۔ اس پر طرفہ ایک جوان لڑکی سے آشنائی بھی تھی جو عمر میں اس کی اپنی بیٹی رُما سے چھوٹی تھی۔ وہ لڑکی، دیویانی، گانا سیکھنا چاہتی تھی جو گوروجی نے دن رات ایک کر کے اسے سِکھا دیا اور سنگیت کی دنیا کے شِکھر پر پہنچا دیا۔ لیکن ان کی عمروں کے بُعد کے باوجود ان کے تعلّقات میں جو ہیجانی کیفیت تھی، اسے دوسرے تو ایک طرف، خود وہ بھی نہ سمجھ سکتے تھے۔ اب بھلا ایسے چاروں عیب شرعی باپ کو کون خریدے؟

اور پھر۔۔۔ جو ہر وقت کھانستا رہے، کسی وقت بھی دَم الٹ جائے اس کا۔

باہر جائے تو نوٹانک مار کے آئے۔ بلکہ لوٹتے وقت پوّا بھی دھوتی میں چھپا کر لے

آئے۔

آخر۔۔۔ دمے کے مریض کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔

گاندھرو داس سنگیت سکھاتے ہوئے یہ بھی کہہ اٹھتا۔ میں پھر گاؤں گا۔ وہ تکرار کے ساتھ یہ بات شاید اس لیے بھی کہتا کہ اسے خود بھی اس میں یقین نہ تھا۔ وہ سُر لگاتا بھی تو اسے اپنے سامنے اپنی مرحوم بیوی کی روح دکھائی دیتی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ابھی تک گارہے ہو؟

اس انوکھے مطالبے اور امتزاج کی وجہ سے لوگ گاندھرو داس کی طرف یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کوئی بہت چمکتی، دمکتی ہوئی شے ہو اور جس کا نقش وہاں سے ٹل جانے کے بعد بھی کافی عرصے تک آنکھ کے اندر پردے پر برقرار رہے، اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑے جب تک کوئی دوسرا عنصری نظارہ پہلے کو دُھندلا نہ دے۔

کسی خورشید عالم نے کہا۔ ”میں خریدنے کو تیّار ہوں بشرطیکہ آپ مسلمان ہو جائیں۔“

"مسلمان تو میں ہوں ہی۔"

"کیسے؟"

"میرا ایمان خدا پہ مسلّم ہے۔ پھر میں نے جو پایا ہے، استاد علاء الدّین کے گھرانے سے پایا ہے۔"

"آں ہاں۔۔۔ وہ مسلمان۔۔۔ کلمے والا۔"

"کلمہ تو سانس ہے انسان کی، جو اس کے اندر باہر جاری اور ساری ہے۔ میرا دین سنگیت ہے۔ کیا استاد عبدالکریم خاں کا بابا ہری داس ہونا ضروری تھا؟"

پھر میاں خورشید عالم کا پتا نہیں چلا۔

دو تین عورتیں بھی آئیں۔ لیکن گاندھرو داس، جس نے زندگی کو ٹانک بنا کے پی لیا تھا، بولا۔ "جو تم کہتی ہو، عین اس سے اُلٹ چاہتی ہو۔ کوئی نیا تجربہ جس سے بدن سو جائے اور روح جاگ اٹھے، اسے کرنے کی تم میں ہمّت ہی نہیں۔ دین، دھرم، معاشرہ نہ جانے کِن کِن چیزوں کی آڑ لیتی ہو، لیکن بدن روح کو شکنجے میں کس کے یوں سامنے پھینک دیتا ہے۔ تم پلنگ کے نیچے کے مرد سے ڈرتی ہو اور

اسے ہی چاہتی ہو۔ تم ایسی کنواریاں ہو جو اپنے دماغ میں عفّت ہی کی رٹ سے اپنی عصمت لٹواتی ہو اور وہ بھی بے مہار۔" اور پھر گاندھرو داس نے ایک شیطانی مُسکراہٹ سے کہا۔ "دراصل تمہارے بچّے ہی غلط ہیں۔"

ان عورتوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ازلی مائیں دراصل باپ نہیں، کسی خدا کے بیٹے کی تلاش میں ہیں۔ ورنہ تین تین چار چار تو ان کے اپنے بیٹے ہیں، مجاز کی اس دنیا میں۔

میں اس دن کی بات کرتا ہوں، جس دن بان گنگا کے مندر سے بھگوان کی مورتی چوری ہوئی۔ اس دن پت جھڑ بہار پر تھی۔ مندر کا پورا احاطہ سوکھے سڑے، بوڑھے پتّوں سے بھر گیا۔ کہیں شام کو بارش کا ایک چھینٹا پڑا اور چوری سے پہلے مندر کی جیوتیوں پہ پروانوں نے اتنی ہی فراوانی سے قربانی دی، جس فراوانی سے قدرت انہیں پیدا کرتی اور پھر ان کی کھاد بناتی ہے۔ یہ وہی دن تھا، جس دن پُجاری نے پہلے بھگوان کرشن کی رادھا (جو عمر میں اپنے عاشق سے بڑی تھی) کی طرف دیکھا اور پھر مُسکرا کر مہترانی چھبّو کی طرف (جو عمر میں پُجاری کی بیٹی سے چھوٹی تھی) اور وہ پتّے اور پھول اور بیج گھر لے گئی۔

مورتی تو خیر کسی نے سونے چاندی، ہیرے اور پنّوں کی وجہ سے چرائی، لیکن گاندھرو داس کو لارسن اینڈ لارسن کے مالک دُروے نے 'بے وجہ' خرید لیا۔ گاندھرو داس اور دُروے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ بوڑھے نے صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کہہ دیا۔ "جیسے تیسے بھی ہو، مجھے لے لو بیٹے۔ بنا بیٹے کے کوئی باپ نہیں ہو سکتا۔" اس کے بعد دُروے کو آنکھیں ملانے، سوال کرنے کی ہمّت ہی نہ پڑی۔ سوال شرطوں کا تھا، مگر شرطوں کے ساتھ کبھی زندگی جی جائے ہے؟ دُروے نے گاندھرو داس کا قرض چکایا، سہارا دے کر اُسے اٹھایا اور مالابار ہِل کے دامن میں اپنے عالی شان بنگلے گِری کُنج میں لے گیا، جہاں وہ اس کی تیمار داری اور خدمت کرنے لگا۔

دُروے سے اس کے ملازموں نے پوچھا۔ "سر، آپ یہ کیا مصیبت لے آئے ہیں، یہ بُڈّھا، مطلب، بابو جی آپ کو کیا دیتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ بیٹھے رہتے ہیں آلتی پالتی مارے۔ کھانستے رہتے ہیں اور یا پھر زردے قوام والے پان چبائے جاتے ہیں۔ جہاں جی چاہے، تھوک دیتے ہیں، جس کی عادت مجھے اور میری صفائی پسند بیوی کو ابھی نہیں پڑی، مگر پڑ جائے گی دھیرے

دھیرے۔ مگر تم نے ان کی آنکھیں دیکھی ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"جاؤ، دیکھو، ان کی روتی ہنستی آنکھوں میں کیا ہے۔ ان میں سے کیسے کیسے سندیس نکل کر کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں؟"

"کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں۔۔۔؟" جمنا داس، دُروے کے ملازم نے غیر ارادی طور پر فضا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ تو سائنس داں ہیں۔"

"میں سائنس ہی کی بات کر رہا ہوں، جمنا! اگر انسان کے زندہ رہنے کے لیے پھل پھُول اور پیڑ پودے ضروری ہیں، جنگل کے جانور ضروری ہیں، بچّے ضروری ہیں تو بوڑھے بھی ضروری ہیں۔ ورنہ ہمارا ایکولاجیکل بیلنس تباہ ہو کر رہ جائے۔ اگر جسمانی طور پر نہیں تو روحانی طور پر بے وزن ہو کر انسانی نسل ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے۔"

جمنا داس اور اتھاولے بھاؤ کچھ سمجھ نہ سکے۔

دُروے نے بنگلے میں لگے اشوک پیڑ کا ایک پتّا توڑا اور جمنا داس کی طرف بڑھاتے

ہوئے بولا۔ ”اپنی پوری سائنس سے کہو کہ یہ تازگی، یہ شگفتگی، یہ شادابی اور یہ رنگ پیدا کر کے دکھائے۔“

اتھاولے بولا۔ ”وہ تو اشوک کا بیج بوئیں۔“

”آں ہاں۔۔۔“ دُروے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں بیج کی نہیں، پتّے کی بات کر رہا ہوں۔ بیج کی بات کریں گے تو ہم خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔“

پھر جمنا داس کے قریب ہوتے ہوئے دُروے بولے۔ ”میں تمہیں کیا بتاؤں، جمنا! جب میں بابو جی کے چرن چھُو کر جاتا ہوں تو ان کی نگاہوں کا مَرم مجھے کتنی شانتی، کتنی ٹھنڈک دیتا ہے۔ میں جو ہر وقت ایک بے نام ڈر سے کانپتا رہتا تھا، اب نہیں کانپتا۔ مجھے ہر وقت اس بات کی تسلّی رہتی ہے۔۔۔ وہ تو ہیں۔ مجھے یقین ہے، بابو جی کی آتما کو بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہو گا۔“

”میں نہیں مانتا، سر۔۔۔ یہ خالی خولی جذباتیت ہے۔“

ہو سکتا تھا، دُروے بھڑک اٹھتا۔۔۔ ہو سکتا تھا وہ جمنا داس، اپنے ملازم کو اپنی فرم

سے ڈسمس کر دیتا۔ لیکن باپ کی آنکھوں کے مَرم نے اسے یہ نہ کرنے دیا۔ الٹا اس کی آواز میں کہیں سے کوئی کومل سُر چلا آیا اور اس نے بڑے پیار سے کہا، ''تم کچھ بھی کہہ لو، جمنا۔۔۔ پر ایک بات تو تم جانتے ہو۔ میں جہاں جاتا ہوں، لوگ مجھے سلامیں کرتے ہیں۔ میرے سامنے سر جھُکاتے، بچھ بچھ جاتے ہیں۔''

دُروے اس کے بعد ایکا ایکی چپ ہو گیا۔ اس کا گلا اور اس کی آنکھیں دُھندلا گئیں۔

''سر، میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔ دنیا آپ کے سامنے سر جھکاتی ہے۔''

''اسی لیے۔'' دُروے نے اپنی آواز پاتے ہوئے کہا۔ ''کہیں میں بھی اپنا سر جھکانا چاہتا ہوں۔ اتھاولے، جمنا داس، اب تم جاؤ، پلیز! میری پوجا میں وِگھن نہ ڈالو۔ ہم نے پتھّر سے بھی خدا پایا ہے۔''

گِری کنج میں لگے ہوئے آم کے پیڑوں پر بور آیا۔ اُدھر پہلی کوئل کوکی، اِدھر گاندھرو داس نے برسوں کے بعد تان اڑائی۔ کوئیلیا بولے امبوا کی ڈار۔

وہ گانے لگے۔ کسی نے کہا۔۔۔ ''آپ کا بیٹا آپ سے اچھا گاتا ہے۔''

"ایسا؟" گاندھرو داس نے بمبیّا بولی میں کہا۔ "آخر میرا بیٹا ہے۔ باپ نے میٹرک کیا ہے تو بیٹا ایم اے نہ کرے؟"

ایسی باتیں کرتے ہوئے نا سمجھ، بے باپ کے لوگ گاندھرو داس کے چہرے کی طرف دیکھتے کہ ان کی جھُرّیوں میں کہیں تو جلن دکھائی دے۔ جب کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی تو کسی نے لقمہ دیا۔ "آپ کا بیٹا کہتا ہے، میرا باپ مجھ سے جلتا ہے۔"

"سچ؟۔۔۔ میرا بیٹا کہتا ہے۔"

"ہاں، میں جھوٹ تھوڑے بول رہا ہوں۔"

گاندھرو داس تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ جیسے وہ کہیں اندر عالمِ ارواح میں چلے گئے ہوں اور ماں سے بیٹے کی شکایت کی ہو۔ بُڑھیا سے کوئی جواب پا کر وہ دھیرے سے بولے۔ "اور تو کوئی بات نہیں، میرا بیٹا۔ وہ بھی باپ ہے۔" وہ پھر ان دنوں کی طرف لوٹ گئے جب بیٹے نے کہا تھا۔ "بابو جی، میں بھی شاستریہ سنگیت میں آپ جیسا کمال پیدا کرنا چاہتا ہوں، مگر ڈھیر سارا روپیہ کما کر۔"

اور بابو جی نے بڑی شفقت سے بیٹے کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔

”ایسے نہیں ہوتا، راجو۔ یا آدمی کمال حاصل کرتا ہے یا پیسے ہی بناتا چلا جاتا ہے۔“
جب دو بڑے بڑے آنسو لڑھک کر گاندھرو داس کی داڑھی میں اٹک گئے، جہاں ڈُروے بیٹھا تھا، اُدھر سے روشنی میں وہ پر زم ہو گئے، سفید روشنی، جن میں سے نکل کر سات رنگوں میں بکھر گئی۔

ڈُروے کو نہ جانے کیا ہوا۔ وہ اٹھ کر زور سے چلّایا۔۔۔ گیٹ آؤٹ۔ اور لوگ چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ہوئے بھاگے۔

گاندھرو داس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور صرف اتنا کہا، ”نہیں۔ بیٹے، نہیں۔“

ان کے ہاتھ سے کوئی برقی روئیں نکل رہی تھیں۔

ڈُروے جب لارسن اینڈ لارسن میں گیا تو فلپ، اس کا ورکس منیجر کمپیوٹر کو ڈیٹا فیڈ کر رہا تھا۔ کمپیوٹر سے کارڈ باہر آیا تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپک رہا تھا اور کارڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لارسن اینڈ لارسن کو اکتالیس ۴۱ لاکھ کا گھاٹا پڑنے والا ہے۔ اس گھبراہٹ میں اس نے کارڈ ڈُروے کے سامنے کر دیا، جسے دیکھ کر اس کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ ڈُروے نے صرف اتنا کہا۔ ”کوئی

انفارمیشن غلط فیڈ ہو گئی ہے۔"

"نہیں سر۔ میں نے بیسیوں بار چیک، کراس چیک کر کے اسے فیڈ کیا ہے۔"

"تو پھر۔ مشین ہے۔ کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو گا۔ آئی بی ایم والوں کو بلاؤ۔"

"مووک۔ چیف انجنیئر تو ساؤتھ گیا ہے۔"

"ساؤتھ کہاں؟"

"تروپتی کے مندر۔ سنا ہے اس نے اپنے لمبے، ہپّی بال کٹوا کر مورتی کی نذر کر دیے ہیں۔"

دُروے ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔ "تم نے یہ انفارمیشن فیڈ کی ہے کہ ہمارے بیچ ایک باپ چلا آیا ہے؟"

فلپ نے سمجھا، دُروے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں، یا ویسے ہی ان کا دماغ پھر گیا ہے۔ مگر دُروے کہتا رہا۔ "اب ہمارے سر پہ کسی کا ہاتھ ہے، تبرک ہے اور اس کے نتیجے کا حوصلہ اور ہمّت۔ مت بھولو، یہ مشین کسی انسان نے بنائی ہے، جس کا کوئی باپ تھا، پھر اس کا باپ۔ اور آخر سب کا باپ۔ جہلِ مرکّب یا مفرد۔"

فلپ نے اپنی اندرونی خفگی کا منہ موڑ دیا۔ ”کیا دیویانی اب بھی بابو جی کے پاس آتی ہے؟“

”ہاں۔“

”مسز دُروے کچھ نہیں کہتیں؟“

”پہلے کہتی تھیں۔ اب وہ ان کی پوجا کرتی ہیں۔ بابو جی دراصل عورت کی جات ہی سے پیار کرتے ہیں، فلپ! معلوم ہوتا ہے انہوں نے کہیں پرکرتی کے چِتون دیکھ لیے ہیں، جن کے جواب میں وہ مُسکراتے تو ہیں، لیکن کبھی کبھی بیچ میں آنکھ بھی مار دیتے ہیں۔“

فلپ کا غصّہ اور بڑھ گیا۔

دُروے کہتا گیا۔ ”بابو جی کو شبد۔ بیٹی، بہو، بھابی، چاچی، للّی، میّا بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ بہو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیار سے اس کے گال بھی چوم لیتے ہیں اور یوں قید میں آزادی پا لیتے ہیں اور آزادی میں قید۔“

”دیویانی؟“

دُروے نے حقارت سے کہا۔ ”تم سیکس کو اتنی ہی اہمیّت دو فلپ، جتنی کی وہ مستحق ہے۔ تیتر بٹیر بنے بغیر اسے حواس پہ مت چھانے دو۔ سنگیت شاید ایک آڑ تھی دیویانی کے لیے۔“

”میں سمجھا نہیں سر؟“

بابو جی نے مجھے بتایا کہ وہ لڑکی بچپن ہی میں آوارہ ہو گئی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو کچھ اس عالم میں دیکھ لیا، جب کہ وہ نوخیزی سے جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ پر وہ ہمیشہ کے لیے آپ ہی اپنی ماں ہو گئی۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ گھبرا کر ایک مرد سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے کے پاس جانے لگی۔ اس کا بدن ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، مگر روح تھی کہ تھکتی ہی نہ تھی۔

”کیا مطلب؟“

”دیویانی کو دراصل باپ ہی کی تلاش تھی۔“

فلپ جو ایک کیتھولک تھا، ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس کے ابرو بالشت بھر اوپر اٹھ گئے۔ اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے نارِ جہنم لپکنے لگی۔ اس نے چلّا کر کہا۔ ”یہ فراڈ

ہے، مسٹر ڈُروے پیور، اَن اڈلٹریٹڈ فراڈ۔“

جبھی ڈُروے نے اپنے خریدے ہوئے باپ کی نم آنکھوں کو ورثے میں لیے، کمپیوٹر کے پس منظر میں کھڑے فلپ کی طرف دیکھا اور کہا۔”آج ہی بابو جی نے کہا تھا، فلپ! تم انسان کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، صرف محسوس کرو اسے۔“

چشمہ بد دور

یہ واقعہ بھی سنیچر ہی کے روز ہوا۔

تم کہو گے کہ تمہارے ساتھ سب واقعات سنیچر ہی کو کیوں ہوتے ہیں؟ تو بولو میں کیا جواب دوں۔ یہی کہہ سکتا ہوں نا، کہ ہفتہ کے باقی دِنوں میں تو میں واقعات کو ہوتا ہوں۔۔۔

بات سیدھی ہے، باقر بھائی۔ سنیچر کے دن میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ایک دن پہلے کوئی چھٹّی نہیں ہوتی (ہاں، سال میں ایک دن ہوتی ہے۔ البتّہ

گُڈ فرائی ڈے والے دن، لیکن چند لوگوں کی بد قسمتی سے بعض اوقات گڈ فرائی ڈے بھی اتوار کو آ پڑتا ہے اور ان کی تعطیل ماری جاتی ہے!) لیکن سنیچر کے روز کوئی ایسی قباحت نہیں ہوتی۔ ایسی سِکّہ بند چھٹّی آتی ہے کہ آدمی سب کی چھٹّی بُلا کے رکھ دیتا ہے۔ وہ یہ بھی بھُول جاتا ہے کہ سنیچر سے ایک دن پہلے اُسے جمعہ کی نماز پڑھنی پڑی تھی۔ نماز تو خیر فرض ہے، اتوار کو بھی۔ لیکن تم سچ بتاؤ، باقر بھائی۔ اپنی سلمٰی کی قسم کھاؤ۔ کیا اتوار کو تمہاری نمازیں قضا نہیں ہوتیں!

یہ سب باتیں تم سے میں اوپن اس لیے کہہ رہا ہوں، کہ تو دَہریا ہے، اگرچہ سیّد زادہ ہے۔ میں نے سب مذہبوں میں دیکھا ہے کہ جو لوگ بانئِ مذہب کی براہِ راست یا چَپ اولاد ہوتے ہیں، وہی مذہب اور اُس کے قوانین کو کم مانتے ہیں۔ ایک دن تم ہی کہہ رہے تھے نا؟۔۔۔ گئے تھے روزے بخشوانے، اُلٹی نماز گلے پڑی، کہا نہیں تھا تم نے؟ دیکھ۔۔۔ اب جھوٹ مت بول، مت کُفر تول۔۔۔

سنیچر کی صبح کو اللہ کائنات کے نمبر دو (پیسے نہیں) ستارے، جسے تم زُحل اور ہم ہندو لوگ سنیچر کہتے ہیں، کو تھوڑا رشوت دینی پڑتی ہے، اور بس۔ اور وہ رشوت بھی آج کل کی رشوت کے مقابلے میں کیا ہے؟ اس سے سو گنا زیادہ تو دہلی کے

ایکا ایکی کے سفر میں ریلوے کا کنڈکٹر گارڈ لے جاتا ہے۔ پولیس کی تو بات ہی چھوڑو۔ تمہارا حادثہ ہوا، چوٹ بھی لگی، گاڑی بھی ٹوٹی اور جب تھانے میں رَپٹ دینے کے لیے گئے، تو محرّر یا ڈیوٹی افسر کیا "سیاں دھیرے سے، سیّاں چُپکے سے" کے انداز میں دراز آپ کے سامنے کھول دیتا ہے۔

سنیچر کے دن رشوت صرف اتنی ہے کہ بس مندر جاؤ، جس کے بغل میں ایک دُکان ہو گی، ہمیشہ ہو گی، جہاں سے تیل، ناریل، ہار وغیرہ مل جائیں گے۔ وہاں سے سرسوں کے تیل کی ایک پلی خریدو۔ سرسوں کا نہ ملے تو کھوپرے ہی کا چلے گا، جو پچیس پیسے میں مل جائے گا۔ تیل ڈالنے کے لیے لوہے کی کٹوری تیل والا خود ہی دے گا اور اُس کے لیے کوئی الگ دام نہیں لے گا، کیوں کہ مُورتی پہ چڑھاوا ہو جانے کے بعد وہ کٹوری اپنے آپ تیل والے کے پاس چلی آئے گی، مع تیل کے۔ اگر تیل والا اور پانڈے جی آپس میں ملے ہوئے ہیں اور پتّی رکھے بیٹھے ہیں، تو ہمیں اس سے کیا؟ ہم تو انجلی کر چکے ہیں۔ تیل والا شروع ہی میں جو آپ کو چند بوندیں کم دے گا۔ اسے ہی کٹوری کا کرایہ سمجھو۔ مندر میں ایک دن میں ہزاروں لوگ آتے ہیں تو ایک ایک بوند کر کے کَے بودیں ہوئیں؟ تم ایک بوند

کو کم سمجھتے ہو؟ اگر وہ کم ہوتی تو شیخ سعدی کبھی نہ کہتے۔ اے کہ تو یک قطرۂ آبی۔۔۔

تو، لوہے کی کٹوری میں تیل، تیل میں چند دانے ماش کے اور ایک پیسا تانبے کا۔ پہلے تو یہی ہوتا تھا، لیکن آج کل تو تانبا رہا ہے نہ پیسا۔ پیسے کی جگہ پانچ دس پیسے نے لے لی ہے اور تانبے کی جگہ نِکل نے، جو کسی نہ کسی طرح سے تمھاری جیب سے نکل ہی آئے گا۔ یہ سب لے کے چلو، کیونکہ دیوتا لوگ بھی موقع شناس اور معاملہ فہم ہو گئے ہیں اور حالات کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا سیکھ گئے ہیں۔ وہ اُنہیں بھی گریہ پیشانی سے قبول کر لیں گے۔

بات یہ ہے، باقر۔۔۔ سنیچر کا تعلّق ہر کالی چیز سے ہوتا ہے، جس کا دان واجب ہے۔ مثلاً لوہا، ماش، کالا کپڑا، چھتری، نمبر دو کا پیسا، تمہارا دل، فلم، لیکن دان کے سلسلے میں تم لوہے کی کٹوری میں تیل تک ہی رہو۔ بہت وہ نہ اُڑو۔ ہاں جو کام پچیس پیسے میں ہو جائے، اُس کے لیے لاکھوں کا کیا سوچنا؟ تیل کی پلی میں اپنا منہ دیکھتے ہوئے مندر کو دہاؤ اور جاتے میں صرف تیل ہی میں دیکھو تمہیں اس میں اپنا چہرہ اپنے باپ کا دکھائی دے گا، جس میں کوئی شرم کی بات نہیں۔ ٹھاکر دوار

پہنچو تو جوتا اُتار دو۔ اُتار لو میں نے کب کہا ہے! آخر دہریے ہو نا؟ جوتا مندر سے باہر بیٹھی ہوئی عورت کی تحویل میں دے دو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ تم عورت کو جانتے ہی ہو نا۔ اگر تم جوتا اُس کے ہاتھ میں نہیں دو گے تو وہ خود لے لے گی، جوتے کے بعد مندر میں جاؤ اور باہر کا سب بھول جاؤ۔ مورتی کے سامنے سر نہوڑاؤ تو کسی عورت کا خیال دل میں نہ لاؤ، چاہے وہ اپنی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ پھر کوئی جاپ، کسی اسمِ اعظم کا ورد کرو۔ اگر یاد نہیں تو نہ سہی۔ کوئی ایسی بات دل میں دہراؤ، جس میں کم سے کم وزن یا ترنّم تو ہو۔ ایک بات تمھیں بتا دوں کہ سب دیوی دیوتا، پیر پیغمبر گدیعنی نثر کے بہت خلاف ہیں۔ اس لیے کچھ بھی یاد نہ آئے تو یہی کہتے جاؤ۔ لالہ موسیٰ چھ چھ پیسے، لالہ موسیٰ چھ چھ پیسے۔۔۔ یہ تمھیں ریل گاڑی کی آواز معلوم ہوتی ہے نا؟ ریل گاڑی ہمیشہ وہی کہتی ہے، جو تم کہتے ہو۔ ایسے ہی بھگوان بھی وہی کہتا ہے جو تم کہتے ہو۔ اُس کے کوش یا لغت میں ہر بات کا ایک ہی مطلب ہے۔۔۔ ہمہ اوست۔۔۔ لالہ موسیٰ نہیں پڑھ سکتے تو دیوی کی پرکرما ہی کرو۔۔۔ وہ سالا۔۔۔ رتن سنگھ کہتا ہے، پرکرما سے میں تھک جاتا ہوں۔ ابے۔۔۔ تھیئے، خار پشت کی اولاد، تو جو دن میں بیس چکّر اُس رانڈ مالا کے

کاٹتا ہے تو کیا تین بھگوان کے گرد نہیں کاٹ سکتا؟

مندر سے باہر آؤ گے تو پہلا بَردان سنیچر کا یہ ملے گا کہ اوپر تمہارے اینگل سے تمہیں جوتی رکھنے والی کے دودھ دکھائی دیں گے، جن میں کوئی دودھ نہیں ہو گا۔ دوسرا یہ کہ چاہے تمھاری جیب میں پیسا بھی نہ ہو، مگر بے شمار بچّے تمہیں گھیر لیں گے۔۔۔ اور پکاریں گے، سیٹھ، او سیٹھ۔۔۔ بس دنیا میں جس کو عورت اور پیسہ مل گئے، اُسے اور کیا چاہیے۔

معاف کرنا باقر بھیّا، میں بات ذرا لمبی اور گھُما پھرا کے کرتا ہوں۔ پروموشن رُک جانے سے میرا دماغ گھوم گیا نا۔ تمہارا جب اور جہاں جی چاہے، ٹوک دینا۔ جن تنتر میں آدمی کو یہی تو حق ہے کہ جھوٹ کو وہ چاہے نہ روکے، مگر سچ کو ضرور ٹوکے۔۔۔

بات میں سنیچر کی کر رہا تھا۔ لیکن فی زمانہ ایک بات اور دوسری میں ربط رکھنا بڑا کٹھن ہو گیا ہے۔ ہمارے سب شاعر اور ادیب اِس کے گواہ ہیں، پر وہ بھی کیا کریں۔ مہنگائی بھی تو کتنی بڑھ گئی؟ قدروں میں اتھل پتھل ہو گیا۔ ربط تو گیا ہی تھا، ساتھ ضبط بھی گیا۔ معلوم ہوتا ہے سمے نے ریسرپن کا ٹیکہ لگا دیا اور دماغ کا وہ

حصّہ ہی ماؤف ہو گیا جو بتاتا ہے کہ پہلے آپ یہ بات کر رہے تھے اور اب یہ کر رہے ہیں۔ انگریزی محاورے میں گفتگو کا تاگا کچھ یوں ٹوٹتا ہے کہ جڑتا ہی نہیں۔ جوڑ میں تو صاف گانٹھ دکھائی دیتی ہے۔ اب تو زندگی تصوّر کے سائبیریا میں، کسی لیبر کیمپ میں گزارو۔ پھر کھانا پینا۔ اب اس بناسپتی کو کھا کر کوئی کسی بدکار یا سرکار سے کیا لڑے گا، جو بازار میں ملتا ہی نہیں؟ چھوڑو سب۔۔۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور

اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

کیسا رہا شعر؟ میں نے اسے ایک ٹرک کے پیچھے لکھا ہوا پڑھا تھا! دراصل شعر اپنے آپ میں اچھا ہوتا ہے نہ بُرا۔ اُس کا بر محل استعمال ہی اصلی بات ہے۔ یہ گُر میں نے مولانا آزاد کے دیوان ''غبار خاطر'' سے سیکھا ہے، باقر بھیّا!

تم نے اُس دن کہا تھا نا کہ رہنے والے ہو تم کیرل کے، نام ہے تمہارا امن، پھر اتنی اچھی اُردو تمہیں کیسے آتی ہے؟ بات یہ ہے کہ تعلیم میں نے عثمانیہ میں پائی۔ وہ تو میری ماں کے مر جانے اور آخر باپ کے ڈر جانے سے بند ہو گئی۔ لیکن پارٹی

مینڈیٹ پہ میں نے اُردُو اور ایک حد تک فارسی میں خاصی شُدبُد حاصل کر لی۔ کہیں پُورا پڑھ جاتا، باقر میاں، تو میں بھی آج کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوتا اور لڑکے لڑکیوں کا گھیراؤ کرتا۔ اب میں بالکل عوام میں سے ہو کر رہ گیا ہوں، جو مجھے آم کی جمع معلوم ہوتے ہیں۔ یوں مجھے عوامی انداز ہی کے شعر اچھے لگتے ہیں۔ غالبؔ اور میرؔ کی شاعری بالکل پسند نہیں۔ ہاں، کون دماغی کسرت کرے؟

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق

اب تم ہی انصاف کرو کہ اگر ہم ہندوستانی آدھی درجن اضافتوں کے متحمّل ہو سکتے ہیں تو پھر سرکار کے خلاف ہمیں کیا وہ ہے؟ اور سنو۔۔۔ شیون میں شب کے ٹوٹی ہے زنجیر، میر صاحب بولو۔۔۔

میں تو اسے عوامی بنانے اور لطف اُٹھانے کے سلسلے میں میر صاحب کی جگہ میم صاحب پڑھ لیتا ہوں۔ اب بتاؤ، میر کے کلام میں معنی پیدا ہوئے یا نہیں؟ عثمانیہ میں جب ہم غالبؔ کا شعر پڑھتے تھے

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا

کھُل گئی ہیچ مدانی میری

تو بہت حیران اور پریشان ہوتے تھے کہ دہن اُس کا نہ معلوم ہوا، پھر اُن کی ہیچ مدانی کیوں کھل گئی؟

تم ہی بتاؤ۔ اچھی بھلی روز مرّہ میں فارسی ہیچمدانی کو گھُسیڑنا کہاں کی شاعری ہے؟ ہاں، اگر تم دھوتی پہ کوٹ اور نکٹائی پہننا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ میں سنیچر کی بات سے ذرا پرَے ہٹ گیا ہوں، لیکن آرہا ہوں، اس کی طرف۔۔۔ یہ چشمہ میرا دیکھ رہے ہو نا؟ اس میں ڈبل کنویکس کے شیشے لگے ہیں۔ عام آدمی ان میں سے دیکھے تو چیونٹی بھی اسے ہاتھی لگے گی۔ شاید اسی لیے میں روسی کونسلیٹ میں کام کرتا ہوں۔ کیوں کہ روسیوں کو ہر چیز اپنے اصل سے سو گُنا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ عوام، دنیا بھر کے عوام کے لیے اُنہوں نے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن عوام کی اتنی گردان کی ہے کہ وہ خواص ہو گئے ہیں۔ تم دیکھنا اگلے پچاس برس کے اندر جو انقلاب آئے گا، وہ خواص ہی کا ہو گا۔ جس کی نیو سب انقلابیوں کی ماں فرانس میں سارتر اورساربون کے طلبہ نے رکھ بھی دی ہے۔۔۔

میری یہ باتیں کونسلیٹ میں نہ کہنا اور نہ یہ بتانا کہ میں سنیچر، راہو اور کیتو کی باتیں

کرتا ہوں۔ نہیں تو میری چھٹّی ہو جائے گی، دھرم سے۔ روسیوں کا یہ ہے نا، کہ وہ کہتے نہیں، کرتے ہیں!

رُوسی محنتی بہت ہیں۔ اُن کے دفتر میں جو کام کرتا ہے، اُس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم ہندوستانیوں میں خون ہے ہی نہیں، ہے تو اُن کے گروپ کا نہیں، شاید اُن کو پتا چل گیا ہے کہ ہر ہندوستانی فطرتاً کام چور واقع ہوا ہے۔ اُس کا بس چلے، بے کار میں بگار ملے تو کبھی کام نہ کرے۔ مغرب میں ہر آدمی کی تمنّا، کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک مصروف رہے۔ لیکن ہندوستانی یہی سوچتا رہتا ہے کہ کب وہ ریٹائر ہو گا اور کام کے جھنجھٹ سے چھوٹے گا۔ بات وہ پانچ سال بعد کی کر رہا ہے، لیکن ٹانگیں ابھی سے پسارنا شروع کر دیتا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو میں بتاؤں۔ ہندوستانی دراصل کام ملنے سے پہلے ہی ریٹائر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہاں کی آب و ہوا نہیں، بلکہ اُس کے کرم و عمل کا وہ فلسفہ ہے، جس پہ ضرورت سے زیادہ ہی زور دینے سے وہ بے عمل ہو گیا۔

نہ تھیسس کو بُلند اتنا کہ۔۔۔ ہر تقریر سے پہلے، اینٹی تھیسس تمہیں آلے۔۔۔

ایک بات ہے، باقر بھائی کہ انسان آخر انسان ہے۔ روس اور امریکہ تو کیا، چاہے وہ ہندستان ہی کا کیوں نہ ہو۔ اسٹیک اور شاشلیک کی جگہ اِڈلی دوسا، مونگ کی دال، مُرغ مسلّم یا کڑاہ پرشاد ہی کیوں نہ کھاتا ہو، مگر زندگی کی ہر اچھی چیز اُسے بھی اچھی لگتی ہے۔۔۔ سنیچر کو مندر سے لوٹنے کے بعد میں نے انڈین ایکسپریس میں پڑھا کہ لِٹل ہٹ ریستوران میں آج مریانا ناچ رہی ہے۔ مریانا ناچتے وقت اپنے بدن پر کہیں صرف انجیر کا پتہ پہنتی ہے۔ ہاں بھائی، لوگ اِسے بھی پہننا ہی کہتے ہیں، پھر سامنے اپنے دودھ پہ وہ مسمریزم کے دو نقطے سے پینٹ کر لیتی ہے۔ حالاں کہ ہماری عورتیں تو کپاس کا کھیت کا کھیت اپنے بدن پر اُگا لیتی ہیں۔

میرے ایک دوست، ارے، تم ہی تو تھے، باقر، جس نے بتایا تھا کہ مریانا کا رنگ گورا ہے نہ کالا۔ بس عشق والا ہے۔ اُس کا باپ لبنانی ہے اور ماں عراقی اور یہ سب کچھ مل کر لوگوں کو مراقی بنا دیتا ہے۔ وہ زیتون کے تیل کی مالش سے اپنے بدن کو اتنا لچک دار بنا لیتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے، اُوپر کے حصّے کا نیچے سے کوئی تعلق ہی نہیں، جیسے ہماری ٹرالی بسیں ہوتی ہیں نا، جس میں ٹرالی پر ڈرائیور ہوتا ہے اور پیچھے سواریاں اور ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

وہ اکثر اُلٹ جاتی ہیں۔ مریانا کو دیکھنے والے بھی تو ایسے ہی اُلٹتے، زخمی ہوتے، مر جاتے ہیں۔۔۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ عورت کے بارے میں ہر مرد کا ایک فیٹش۔۔۔ خبط ہوتا ہے، چنانچہ میرا خبط اُس کی کمر ہے۔ اور تم جانو باقر بھائی، دنیا کے سب فساد عورت کی کمر سے شروع ہوتے ہیں!

تو سنیچر کی ایک شام کو میں نے ولادی میر، اپنے فوری اُوپر کے افسر سے دو گھنٹے کی چھٹی مانگی، لیکن اُس نے اتنے رُباب سے "نیئت" (نہیں) کہا کہ مجھے اس کی نیّت پر شک پیدا ہو گیا۔ ایسی قطعیت صرف روسی ہی کے لہجے میں ہو سکتی ہے۔ اُس کے ساتھ والے میز پر ولادی میر وارناف کا فوری افسر نکولائی کرپاٹکن بیٹھا تھا۔ اب روسی دفتروں میں ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنے فوری افسر کے اوپر کے فوری افسر سے بات نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں نے اپنی درخواست کو ولادی میر وارناف ہی کے سامنے دہرایا، بیوی کی بیماری کا بہانہ بنایا۔ لیکن وہ جواب میں بولا۔ نہیں، گھنٹہ بھی نہیں۔ مجھے زیادہ بُرا اس لیے نہیں لگا کہ میں جانتا تھا، اس کی ہندی میری روسی سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ اس لیے گھونٹ کا خون پی کر رہ گیا۔ یعنی کہ چُپ ہو گیا۔ چُپ تو ہم پہلے ہی رہتے تھے، مگر اب اور بھی چُپ ہو گئے۔

یہ اور بھی چُپ، کیا ہوتا ہے۔ یہ تم نہ جان سکوگے میری جان، کیونکہ تم دفتر کے بیابان میں کبھی کھوئے ہی نہیں۔۔۔ عام طور پر دفتر سے چھ بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ ابھی پورے دس منٹ باقی تھے کہ میں نے انوائیسیس سمیٹنا شروع کر دیں اور ولادی میر کی طرف اس لیے نہیں دیکھا کہ وہ ضرور میری طرف دیکھ رہا ہو گا۔ میرے دماغ میں مریانا کے بارے میں اپنے آپ ایک نظم چل رہی تھی۔ مریانا، او مریانا، تیرے لیے آج۔ مر جانا۔۔۔ کیسی ہے؟ ارے نہیں باقر بھیّا۔ کہاں پشکن اور کہاں میں؟ لیکن یہ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ میری نظم پشکن کی ۱۸۳۱ء میں کہی گئی نظم، جب تو میری بانہوں میں ہوتی ہے، سے ملتی ہوئی ضرور معلوم دیتی ہے۔ انیسویں صدی کے شروع اور اس کے آخر تک اُردُو کا ادیب تو یہی لکھا کرتا تھا۔ جب تو میری بانہوں میں ہوتا ہے! کچھ بھی ہو، مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری یہ نظم ایک دم 'تباہ زاد' ہے، اس میں کوئی سرقہ نہیں۔ شعر میں اگر تم مجھے جوشؔ سے ملاؤ تو مجھے بُرا نہیں لگے گا، البتّہ کیوں کہ میں بھی آخر اُنہی کے وزن کا تخلص فرماتا ہوں۔ ہوش! جیسے تیسے بھی میں نے وہ دس منٹ گزارے۔ پھر روسی فراخ دل بھی ہوتا ہے۔ کیا بتاؤں، باقر، دس منٹ کے بعد

مجال ہے جو ولادی میر نے ایک نظر بھی میری طرف پھینکی ہو۔ یا نکولائی کرپاٹکن نے ولادی میر وارناف کی طرف!

کچھ دیر میں مَیں بس پکڑ کر لِٹل ہَٹ میں پہنچ گیا۔

لِٹل ہَٹ۔ دراصل ایک بڑے ہوٹل کا حصّہ ہے۔ اس کا نام ہی لِٹل ہے، ورنہ اچھی خاصی جگہ ہے اُس میں۔ چیزوں کی وسعت کو آخر پیمانے ہی سے تو نہیں ناپا جاتا۔ ہمارے سامنے اور بھی بہت کچھ ہے۔ دیکھو نا اتنی بڑی کائنات اور پھر اس میں ماں کی گود۔ مائیکرو کازم میں مائیکرو کازم بمبئی شہر کی رونق بڑی ہے، یا سلمیٰ کی بانہوں کا سکوت؟ نصیبن کا برقع بڑا ہے یا مریانا کا انجیر کا پتّہ؟ اگر مالکوں نے دیواروں کو خاص رنگ کا اثر دے رکھا تھا، یا اُن پہ ایسے ہی تجریدی چہرے ٹانک رکھے تھے، تو محض لوگوں کو بھرمانے کے لیے۔ بعض وقت بدصورتی ارادے سے بھی پیدا کرنی چاہیے تاکہ دوسروں کو اپنا آپ خوبصورت لگے۔ آج کا آرٹ یہی سب تو کرتا ہے۔

لِٹل ہَٹ، ہر عمر، ہر نوع کے لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس کی وجہ صرف مریانا کا ناچ، اُس کے بدن کا لوچ اور خوبصورتی ہی نہیں تھی، بلکہ وہ خلا بھی جسے پاٹنے کی

خواہش شادی کے تیسرے چوتھے سال ہی مرد اور عورت میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یا پھر زندگی کی سادہ سی حقیقت، کہ کچھ گھوڑے دوڑتے ہی اُس وقت ہیں، جب ساتھ والے دوڑیں۔

کونے میں مجھے ایک سیٹ نظر آئی، جس کے ایک طرف کوئی دُبلا پتلا منحنی سا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ شکل سے لائبریرین معلوم ہوتا تھا۔۔ کمال کی بات ہے نا، باقر بھائی، تعارف پر وہ سچ مچ ہی یونائٹیڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس کا اسسٹنٹ لائبریرین نکل آیا۔ تم کہو گے کہ لائبریرین کی کوئی خاص شکل ہوتی ہے؟ تو میں کہوں گا، ہاں۔ اُس کے چہرے ہی پہ کارڈ انڈکس ہوتا ہے۔ جیسے ہر شاعر کی ناک میں تھوڑی رطوبت اور منہ میں زیادہ لعاب ہوتا ہے۔ پھر لائبریرین کی آنکھیں یوں گھومتی ہیں، جیسے صفحے اُلٹ رہی ہوں۔ مریانا کی بات چھوڑو۔ اُس کی کمر تو صفیں اُلٹتی ہے۔۔۔

اس اندازے میں کبھی کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہر امریکن شروع میں بے حد ذہین نظر آتا ہے۔ مگر "جیسے ہی دُم اٹھاؤ، مادہ" والی بات۔ اُسے ڈی سی آٹھ ہوائی جہاز کے سب کل پُرزے معلوم ہوں گے، لیکن اپنے غسل خانے کی

ٹونٹی، جس کی چوڑیاں گھس گئی ہیں، اُسے کیسے بند کرنا ہے وہ نہیں جان سکتا۔

یہ تم نے دیکھا ہی ہے نا کہ اکثر مُلک سے آدمی پہچانا جاتا ہے اور آدمی سے مُلک۔ یہ صرف ہندوستان ہے۔ کشمیر سے لے کر راس کماری تک پھیلا ہوا ہندوستان۔ ہر رنگ، ہر نقش کا مالک، جس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ مگر جیسے ہی وہ منہ کھولتا ہے تو آدمی سر پیٹ لیتا ہے۔ دَھت! یہ تو وہی ہے!

اس اسسٹنٹ لائبریرین نے اپنی انگریزی میں بہت امریکی غنغنا پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن ہندی کہیں نہ کہیں سے اپنا منہ باہر نکال ہی لیتی ہے، بلکہ اس عمل میں ایک عجیب دوغلی سی چیز پیدا ہو گئی۔ ہندوستانی غنغنا!

اُس نے جو بش شرٹ پہن رکھی تھی اس پہ لیکس، پلیکس کے فحش جملے چھپے ہوئے تھے۔ دھندلی سی پورنو تصویروں کے اُوپر در، پھر ان سب کو ایک بجلی رنگ کی وسیع و عریض نکٹائی نے ایک حد تک چھپا رکھا تھا۔ نیچے بیل باٹم کے اُس نے جیسے ارادے سے پھونسڑے نکال رکھے تھے۔ چہرے پہ دونوں طرف پشکن کی طرح کی بڑی بڑی قلموں کے گچھے۔۔۔ گویا وہ عام آدمی اور ہپّی کے بیچ پیوند معلوم ہوتا تھا۔ وہ۔۔۔ کوئی کتاب ہونے کی بجائے اُس کا سر ورق تھا!

یہ تم تھے ؟ نہیں نہیں، تمہاری ہی طرح کا کوئی اور تھا، جس نے شادی کرنے کے لیے امریکہ سے ایک لڑکی ہپّی فیرا گولو (جس کے آبا و اجداد اٹلی سے جا کر امریکہ میں آباد ہو گئے تھے) آئی تھی۔ خیر فیرا کو کرو فائر اور گولو کو مارو گولی، لیکن ایک بات اس نے آج کے ہندوستانی نوجوانوں کے بارے میں بڑے پتے کی کہی تھی۔ یہ۔۔۔ امریکنوں سے بھی کچھ زیادہ ہی امریکن ہیں۔ کیا مزے کی عورت تھی، باقر، ایسی عورت جو مرد سے ملے بِنا ہی اُس سے کئی بار مل چکنے کا عالم پیدا کر لیتی تھی۔ آج کی دنیا میں سب سچ ہے، میرے بھائی۔ کل پڑھا نہیں کہ مُرغ کو تکلیف دیے بغیر ہی لوگ مرغی سے انڈے پیدا کرنے لگے ہیں۔۔۔ میں پھر بہک گیا اور تم بھی مجھے نہیں ٹوکتے۔ تم بھی ذہنی طور پر وہ ہو۔۔۔ وہ۔۔۔ اب ہنستے کیوں ہو؟ پکڑے گئے نا؟ تم بھی اُس لڑکی کی طرح سے ہو، جس کے غسل خانے کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ جاتا ہے، جی، غلطی سے!

وہ ہپّی فیرا گولو۔۔۔ سیدھے مُرغی سے انڈے۔۔۔ ہم مرد کی جمع، مردودوں کا کیا ہو گا، باقر بھیّا؟

ارے ہاں، میں بھول ہی گیا۔ یہ عورتوں کا سال ہے، اقوام متحدہ کے مطابق۔

عورتوں کو تم جانتے ہی ہو۔ کیسے وہ اپنی کمزوری کا افسانہ مشہور کر دیتی ہیں اور کمزوری کو بھول ہی جاتی ہیں۔ سال ختم ہونے دو، اگر عورت سالی نے اسے صدی پہ نہ پھیلا دیا تو مجھے باپ کا نہ کہنا۔

میں مرد شوونسٹ نہیں۔ اگر صدیوں سے مرد نے اسے روندا ہے تو اب وہ اُسے روندے، مگر میں نے دیکھا ہے کہ وہ تو چپکے سے سامنے پڑی رہتی ہے، جیسے روندے جانے کی منتظر۔۔۔ خیر وہ اُسے روندے یا یہ اُسے روندے، بات ایک ہی ہے۔ عوام اور خواص کے جدل کی طرح۔۔۔ مگر، غضب خدا کا عورت جو حقّہ بھی نہیں پیتی، حقوق مانگتی ہے!

ضروری بات تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ پہلے سنیچر کاندھے پر چڑھ بیٹھا تھا، اب حیف کہ عورت سر پر سوار ہو گئی ہے۔۔۔ ضروری بات یہ ہے کہ وہ اپنا لائبریرین دوست بھی چشمہ لگاتا تھا۔ مجھ میں اور اس میں فرق یہ تھا کہ اس کے چشمے میں ڈبل کان کیو کے شیشے لگے تھے، جیسے میرے میں ڈبل کنویکس کے۔ عام، صحت مند نظر والا اگر ڈبل کان کیو میں سے دیکھے باقر بھائی، تو اسے ہاتھی بھی چیونٹی دکھائی دے گا۔ جیسے میرے میں سے چیونٹی بھی ہاتھی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکنوں کو دنیا

کے سب لوگ کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں۔

میں ویت نام اور مائی لائی کی بات نہیں کرتا، کیوں کہ جدیدیے مجھ پہ دزدیدہ ترقّی پسند ہونے کا الزام لگا دیں گے۔ لیکن باقی دنیا ہی کا دیکھو۔ لیبیا اور اسرائیل میں انہوں نے کیا غدر مچایا ہے۔ ملکوں کو کیسے کیسے ہتھیار دے کر لڑوایا اور خود نفع کمایا ہے۔ شاید اس لیے کہ ان ملکوں کے اپنے ہتھیار کُندیا متروک ہو چکے ہیں۔ کوریا میں ۸۰ فیصد جو لیکوریا ہے، اس کا ذمّہ دار کون ہے؟ پھر آیندے یا چلی کا حشر دیکھا ہی ہے نا تم نے؟ ارے وہ شیخ چلی دوسرا تھا۔۔۔

جیسے میں اپنے ڈبل کنویکس کی وجہ سے روسی کونسلیٹ میں ہوں، وہ ڈبل کان کیو کی وجہ سے امریکی انفارمیشن سروس میں تھا۔ لیکن قدرت بھی ہم ہندوستانیوں سے عجیب عجیب طرح سے بدلے لیتی ہے۔ اُس نے اچھی بھلی اسکاچ چھوڑ کر کینیڈا کی سی گرام کا آرڈر دے دیا، صرف اس لیے کہ وہ امریکا کا پڑوسی ہے۔ میں روسی، ڈرنے والا تھوڑے ہی تھا! میں نے بھی وودکا کی حکم کے طریقے سے فرمائش کی، جیسے روسی کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ وودکا روس کی نہیں، یہیں آس پاس کہیں کیرالہ میں کشید کی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ہم دونوں میں

کشید گی پیدا ہونے لگی۔ ابھی ہمارے احساسات نے کوئی واضح شکل اختیار ہی نہیں کی تھی کہ بیچ میدان کے کود کے آگئی۔۔۔ مریانا!

گوانی آرکسٹرا میں سے جھانجھے والے نے زور زور سے جھانجھے بجائے۔ پردے کے پیچھے سے بڑے کھرج والی پال رابسنی آواز آئی۔۔۔ مر۔۔۔ یا۔۔۔ نے۔۔۔!

مجھے نہیں معلوم تھا کہ مریانا کو مریانے بھی کہہ سکتے ہیں، یا کہتے ہیں۔ میرے اندر جو نظم پیدا ہو رہی تھی، ایکا ایکی بد نظمی کا شکار ہو گئی۔ سب قافیے غلط ہو گئے میرے۔ ہوش اُڑ گئے!

پھر گوانی آرکسٹرا۔۔۔ اور مریانا کا ناچ۔

چھک چھک۔ چھکا چھک۔

دھک دھک، دھکا دھک۔۔۔ ہے اے اے اے ے ے ے ے!۔۔۔ اور کمر!

یہ سب نیگرو اسپری چوال تھا اور نہ ہپّی ہریسنی میوزک۔ کوئی دوغلی چیز تھی، جو

اب ہندوستانی کے بجائے افریقی طنطنہ ہو گئی تھی۔ اصلی چھٹی تو ہوئی، جب مریانے نے کمر، ناف سے آواز نکال کر گانا شروع کیا۔۔۔تم میرے لیے کیا لائے ہو؟

آر گل کی جُرابیں لائے ہو۔۔۔اچھا کیا، اچھا کیا۔

تم میرے لیے کیا لائے ہو؟

موز نبیقی موتیوں کی مالا لائے ہو۔۔۔اچھا کیا، اچھا کیا۔

موں مارت کا عطر لائے ہو۔۔۔اچھا کیا، اچھا کیا۔

میں تو تمہارے لیے کچھ نہیں لائی، جان!۔۔۔ میرے پاس تو ایک دل ہے، جو صرف تمہارے لیے ہی دھڑکتا ہے۔۔۔ اور پھر۔۔۔

اچھا کیا، اچھا کیا۔۔۔

ارے باقر میاں، مرد بڑا اُلّو کا پٹھّا ہے۔۔۔ وہ جانتا بھی ہے کہ ہال میں اس ایسے سینکڑوں دوسرے۔۔۔ تیسرے بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ یہی سمجھتا ہے اور سمجھنا چاہتا ہے کہ وہ جو بھی کہہ رہی ہے، مجھی سے کہہ رہی ہے۔ لِٹل ہَٹ،

میں لڑکیاں بھی تھیں، مگر ان کا مت پوچھو۔ وہ یا تو مریانا کی نظروں سے مردوں کو دیکھ رہی ہوں گی اور یا پھر سیدھے اُس کے 'لباس' کو۔ حقیقت باقر بھائی، جلیبی کی طرح سے سیدھی ہے۔ مرد سب سے زیادہ کیا پسند کرتا ہے۔۔۔؟ عورت! عورت سب سے زیادہ کیا پسند کرتی ہے۔۔۔ شاپنگ!

اس سلسلے میں تم تیّار ہو، باقر، چونکہ یہ عورتوں کا سال ہے۔ ہمارا تمہارا سب کچھ بِک جانے والا ہے۔ ڈیمانڈ اتنا بڑھ جائے گا کہ سپلائی بند ہو جائے گی!

ایک بات اور بھی ہے۔ آزاد ہو کر شاید یہ عورتیں ہماری عزّت کرنے لگیں۔ ہم عورتوں کی جتنی عزّت کرتے ہیں، یہ خود عورتیں بھی نہیں جانتیں۔۔۔ تم ہی بتاؤ ہم نے کبھی کسی کو باپ بھائی کی گالی دی ہے؟

کیا بتاؤں، دوست؟ مریانا کے ناچ گانے سے 'لِٹل ہٹ' کے رجنی گندھا اور ڈاھلیا تو ایک طرف، کیکٹس بھی مہکنے لگے تھے۔۔۔ دیکھو، اب تم شرارت مت کرو۔ خدا گواہ ہے کہ کیکٹس کے سلسلے میں میرا اشارہ قطعاً سردار جی لوگوں کی طرف نہیں ہے۔ ایسا کروگے تو مجھے پٹوا دوگے، مروا دوگے۔۔۔ اگر میں ان کی بات کرتا تو کہتا کیکٹس بھی لہکنے لگے تھے، چہکنے لگے تھے۔ بہت وہ کرتا تو کہتا۔۔۔ بہکنے

لگے تھے۔ مہکنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟

کچھ دیر بعد مریانا اپنا لباس۔۔۔ انجیر کا پتّا بدلنے کے لیے اندر چلی گئی تھی اور میں ہوش میں آنے کے بجائے جوش میں آ چکا تھا۔ قافیے میرے سامنے یوں کھل گئے جیسے میرا ذہن نور اللّغات ہے۔ لیکن بد قسمتی سے میرا اُس اسسٹنٹ بلکہ اسسٹنٹ لائبریرین سے جھگڑا ہو گیا۔ بات یوں ہوئی کہ میں پہاڑی کی دُھن پر دھیرے دھیرے گانے لگا۔ پھر دماغ ہی تو ہے نا۔ میرا خیال اُس عظیم مغنّی سہگل کی طرف چلا گیا اور میں نے اُس کارڈ انڈکس سے پوچھا۔۔۔ آپ کو یاد ہے، سہگل کب مرا تھا؟ جانتے ہو کیا جواب دیا اُس نے؟ بولا۔۔۔ ابھی ابھی، میرے سامنے ہی تو مرا ہے۔۔۔ میری سینس آف ہیومر کو تو تم جانتے ہی ہو، کتنی تیز ہے۔ روسیوں کی طرح سے۔ میں اُسی وقت سمجھ گیا!

یہ امریکی سالے۔۔۔ واٹر گیٹ والے۔ اپنا اسلحہ دوسرے ملکوں میں بھیج کر انھیں لڑواتے ہیں۔ خود منافع کھاتے ہیں۔ ہم روسی بھی بھیجتے ہیں، لیکن اُن کے ہتھیاروں کو بے کار کرنے، دنیا میں امن لانے کے لیے۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں اُن کے ہتھیار اُنہی پہ استعمال کروں۔ مجھے امریکی مارک ٹوئین یاد آ گیا۔ میں

نے خالص روسی دبدبے سے اپنے مزاح کی حِس کو تھوڑا ڈل کر کے اُس سے پوچھا۔ آپ جانتے ہیں، ایک لائبریرین اور گدھے میں کیا فرق ہے؟ ہو سکتا تھا، اس آناً فاناً کے سوال سے سیدھے ہی لڑائی شروع ہو جاتی، لیکن وہ میرے تن و توش، تخلص ہوش، روسی جوش کو دیکھ کر تھوڑا ڈر گیا اور ل۔۔۔ لکنت سے بولا۔ مجھے نہیں معلوم!

میں نے کہا، مجھے بھی نہیں معلوم۔۔۔

اور اپنے اس لطیفے پہ میں خود ہی اتنا ہنسا کہ آس پاس کے لوگ بھی ہنسنے لگے۔ وہ مقولہ ٹھیک ہی تو ہے کہ ہنسو تو دنیا تمہارے ساتھ ہنسے گی، روؤ تو۔۔۔ پھر بھی وہ ہنسے گی!

چونکہ اس کو پتا چل چکا تھا کہ میں روسی کونسلیٹ میں کام کرتا ہوں، اس لیے اس نے سیدھے ہی روسیوں کی بُرائی شروع کر دی۔ مجھے بڑا تاؤ آیا، باقر بھائی۔۔۔ کوئی تمہاری تائی کو بھی گالی دے، یہ جانتے ہوئے کہ تم میرے جگری دوست ہو، تو بتاؤ وہ گالی تمہیں لگے گی یا مجھے!

میں نے چشمہ اُتار کر میز پر پٹخ دیا اور "سی آئی اے" کو گالی دی۔

وہ کے جی بی کو بیچ میں لے آیا اور میرے چشمے کا جواب اپنے چشمے سے دیا۔

میں نے خالص پرولتاری انداز سے جوتا اُتار کر میز پر مارا، جیسے خرشچوف نے اقوام متحدہ کے جلسے میں مارا تھا۔ اس سے دونوں چشمے میز پر یوں اُچھلے جیسے وہ مُرغ ہیں اور آپس میں لڑ رہے ہیں۔۔۔

میں نے روزن برگ کے مار دیے جانے کی بات کی۔ میرا بس چلتا تو فیض کی نظم اُس کے منہ پہ دے مارتا۔۔۔ وہ سالا سکھاروف اور سولہژنسن پہ چلا آیا اور اُس کی گلاگ آر کی پیلیسگو سے حوالے دینے لگا۔۔۔ اُس موٹے تازے کتّے کی بات کرنے لگا، جو فرانس میں اس لیے چلا آیا تھا کہ اُس کے اپنے ملک میں روس میں کھانے کو تو بہت دیتے ہیں، مگر بھونکنے نہیں دیتے۔۔۔

میں نے اسٹووروں کی خلیج کا قصّہ چھیڑ دیا (سنا ہے خاص نام کا ترجمہ نہیں کرتے) اُس نے چیکوسلواکیہ سے زنا بالجبر کی بات کی (تو کیا عام کا ترجمہ کرتے ہیں؟) میں نے مافیا، کارٹل، پورنو، بلو فلموں۔۔۔ سب کو بیچ میں گھسیٹ لیا اور خوب ہی اس

کی بے عزّتی کی۔

اب ہماری آوازیں اونچی ہو کر اِرد گرد کی سب آوازیں کو بونا کیے دے رہی تھیں۔ ارے ارے۔ اے یو، لِسن،۔۔۔ سب بے کار ہو گیا تھا۔۔۔ یہ کیا مچھلی منڈی ہے؟۔۔۔ ایسے میں یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ برابر کی میز پہ بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی جملہ محبت کو ہونٹوں تک لائے اور پوچھ سکے۔ کب ملو گے، جان، کہاں ملو گے؟

معلوم ہو رہا تھا کہ ہماری وجہ سے وہ کبھی، کہیں بھی نہیں مل سکتے۔

"تم بات کرتے ہو یینکی۔" میں نے چلّا کر کہا، جس کی تہذیب ہی جمعہ جمعہ چار سو سال پُرانی ہے۔ جو کبھی مہیش یوگی کا سہارا لیتا ہے اور کبھی پر بھوپاد کی دُم سونگھتا ہے۔۔۔ ہرے رام، ہرے کرشن کے بچّے؟"

"تو کیو مِس کے نطفے۔۔۔"

اور ہم دونوں بیک وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور گرج گرج کر باتیں کرنے لگے "تم ہندوستانی جاہل ہوتے ہو، بد تمیز ہوتے ہو۔" اُس نے کہا۔ "دروازہ کھٹکھٹائے

بغیر تو کمرے میں چلے آتے ہو۔"

میں نے اسی پائیدار آواز میں کہا۔ "ہندوستانی ہو گا تیرا باپ۔ تو جب اس دنیا میں آیا، کوئی دروازہ کھٹکھٹایا۔ اب تک ہم دونوں مکمل طور پر روسی اور امریکن ہو چکے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہیں ہاٹ لائن پر سے آواز آ رہی ہے۔ روکو، روکو۔ لیکن ہم دونوں اس بات کے لیے تیّار تھے کہ بٹن دبائیں اور دونوں ملکوں کے آئی سی بی ایم چھوڑ کر نیویارک اور ماسکو کو تو تباہ کر دیں۔ اسلام آباد اور دہلی کا پھر دیکھا جائے گا۔۔۔"

پہلے میز اُلٹی۔ پھر کرسیاں گریں۔ اُن کے بیچ میں سے ہوتا ہوا لِٹل ہٹ کا منیجر ہم تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عورتوں کے سال والی ایک عورت بے ہوش ہو گئی، سالی۔ کچھ لوگ موقع کا فائدہ اُٹھا کر باہر بھاگ گئے اور بِل ادا کرنے کے عذاب سے چھوٹے۔ یہی نہیں کچھ لوگ دہشت کے عالم میں اندر گھس آئے۔ مریانا ونگ میں آدھی اندر، آدھی باہر دکھائی دے رہی تھی۔ چشموں کی غیر موجودگی میں صرف اتنا ہی دکھائی دے رہا تھا کہ وہ کالا گاؤن پہنے ہوئے ہے۔ اس سالے اسسٹنٹ نے مجھے ٹائی سے پکڑ رکھا تھا، مگر اس کے ہاتھ صاف کانپتے

ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اُس کی بش شرٹ کے کالر کو اتنے زور سے مروڑا کہ اُس کا گلا گھُٹ گیا۔ اُس کی آنکھیں باہر چلی آئی تھیں۔ باہر تو زبان بھی چلی آئی تھی، مگر تھوڑی سی۔۔۔

اب جس زبان سے وہ گالی دے رہا تھا، وہ کسی ملک کی نہ تھی۔ یہ وہی آواز تھی، جو زبان کی ایجاد سے صدیوں پہلے انسان غاروں میں بولا کرتا تھا۔۔ یا ہو سکتا ہے وہ کوئی فری میسنری ہو، کوئی اسپرانٹو۔ نہیں، اب مجھے یاد آتا ہے وہ۔ کُو کُو کُو کُو کلاں تھی!

پھر ہندوستانی فلم کی طرح سے جانے کہاں سے گلدان اس کے ہاتھ میں آ گیا اور اُس نے میرے سر پہ دے مارا۔ اگر ہمارے فلم ساز امریکی فلموں کی نقل نہ کرتے تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ میں چکرا گیا۔ جبھی ایک چیخ سی آئی۔ ''گیٹ آؤٹ، ول یُووووو۔۔۔'' اور ہال کے ایک طرف کی بتّیاں بجھ گئیں۔ اسپاٹ لائٹ ہمیں پر تھی، جیسے کہ تھیٹر میں مرکزی کرداروں پر ہوتی ہے۔

''دیکھا نہیں'' اُس نے پاس آتے، پورا بازو باہر کے دروازے کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''رائٹرز آف ایڈمیشن ریزروڈ۔'' پاس کے کسی ستم ظریف نے اُس

تحریر کی طرف دیکھا جو دروازے کے باہر لکھی ہوئی تھی اور اس طرف سے اُلٹی پڑھی جارہی تھی۔ اُسے پہلے حرف ڈی دکھائی دیا ریز روڈ کا اور وہ بولا۔۔۔ڈی فار ڈیول، ای فار ایول۔۔۔ لیکن مینیجر کڑکا۔ ”آپ باہر نکلتے ہیں یا میں پولیس کو بلواؤں؟“

اب سچّی بات ہے، باقر بھائی، روسی ہونے کے باوجود میں تھوڑا ڈر گیا۔ ہاں اس جانبداری سے مجھے لینن پرائز تو کیا نہرو ایوارڈ بھی نہیں ملنے والا تھا۔ پولیس کی دھمکی دیتے ہی مینیجر بیَروں کی مدد سے خود ہی پولیس ہو گیا۔ ہم نے میز کے نیچے ہاتھ مار کر چشمے ٹٹولے، اُٹھائے اور لڑتے بھڑتے باہر کی طرف لُڑھکے۔ وہ امریکی مجھ سے پہلے نکل گیا تھا، ورنہ میں تو اُس کے ساتویں بیڑے کا بحیرۂ عرب، بحر الہند تک پیچھا کرتا۔ حالاں کہ ہال کی بجھی ہوئی بتّیوں کے بحیرۂ اسود سے یہ سب کتنا بڑا فاصلہ تھا!

لِٹل ہَٹ کے باہر آیا تو کوئی دھندلی سی سفید چیز جیسے اُڑتی ہوئی دکھائی دی۔ غالباً وہ اُس امریکی پلّے کی گاڑی ہو گی۔ میں نے صرف آواز سنی۔

”جلدی، شوفر، جلدی۔۔۔“

اپنے سسٹم سے بدلہ نہ نکال سکنے کی وجہ سے، میں ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا، ایسے ہی مجھ سے کوئی تکرار شروع کر دے تو میں اُسے بتاؤں، جیسے اندر کی جارحیت کو خارج کرنے کے لیے لوگ ریت کی بوریاں ٹانگ کر اُس پہ مُکّے مارتے ہیں۔ خواب میں بھیڑیے کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اُسے پھاڑ کر ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی میں۔۔۔ مگر کوئی ماں کا لال سامنے نہ آیا اور میں اندازے سے بس اسٹینڈ کی طرف مُڑا۔ چشمہ لگایا تو سامنے ایک چابی لگی کھلونا بس، مجھے اسٹینڈ کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔۔۔ ارے!؟

باقر بھائی۔۔۔ ہمارے چشمے بدل گئے تھے۔ اس جھگڑے فضیحتے میں وہ میرا چشمہ لے گیا تھا اور اس کا میرے ہاتھ میں آ گیا۔ فریم قریب قریب ایک ہی سے تھے، یا ہمیں ایسے لگ رہے تھے۔

اُس وقت گیارہ بجے تھے رات کے، جو میں نے یونیورسٹی کے گھڑیال میں کانوں سے دیکھے اور آنکھوں سے سُنے۔۔۔

میرا پہلا تجربہ بس کا تھا۔ اُس چشمے کے ساتھ۔

کچھ بھی نہ دکھائی دینے سے کچھ دکھائی دینا تو اچھا ہی تھا۔ چنانچہ میں نے وہ چشمہ پہنے رکھا، لیکن جب میں بس میں بیٹھنے کے لیے آگے بڑھا تو یوں لگا جیسے اتنے تنگ دروازے سے میں اندر کیسے جاؤں گا؟ لیکن اپنے بدن کو سکیڑ کر میں نے ڈیک پر قدم رکھا ہی تھا تو دیکھا کہ کوئی بچّہ بس پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، چنانچہ میں نے اپنا پاؤں پیچھے ہٹا لیا۔ ایسے ہی بچّے نے بھی کیا۔ شاید وہ میری بزرگی کا احترام کر رہا تھا۔ میں نے پھر قدم بڑھایا تو اس بچّے نے بھی ساتھ بڑھا دیا اور میں نے پھر کھینچ لیا۔ جبھی بس کنڈکٹر کی آواز آئی۔ ''صاحب، دارو پِیے لا کیا۔۔۔؟'' اور اُس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بس کے اندر گھسیٹ لیا اور سیٹ پر جا بٹھایا۔ جب مجھے پتا چلا کہ وہ پاؤں بچّے کا نہیں، میرا اپنا ہی تھا!

بس کنڈکٹر کی آواز آئی۔ ''دیکو۔۔۔ کوئی لفڑا نہیں کرنے کا آں؟'' وہ اب تک مجھے پیئے ہوئے سمجھتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں نے پی نہیں، کنڈکٹر، تھوڑی سی پی ہے۔ مگر میری نظر کمزور ہے۔''

''تو پِر چشمہ کاہے کو رکھا؟'' وہ بولا۔

اب میں کہاں اتنی لمبی راون کہانی دُہراتا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ''ورلی ناکا آ

جائے تو مجھے اُتار دینا۔۔۔"

"ہو" اُس نے کہا۔ پیسے لیے، ٹکٹ دیا اور دوسری سواریوں کی طرف متوجّہ ہو گیا۔

سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے اپنا چشمہ اُتار لیا۔۔۔ دیکھو، میں پھر اُسے اپنا ہی کہے جا رہا ہوں۔ عادت نہیں چھوٹتی نا، اس کے بغیر جیسے مجھے ہمیشہ لگتا تھا، آج بھی ویسے ہی لگا کہ بس کھڑی ہے اور سڑک کی روشنیاں اپنے گرد بے شمار کرنیں اور ہالے لیے نصف دائرے میں گھوم رہی ہیں۔ اور بڑے بڑے دھبّے، نیلے پیلے، اُودے کالے، جو نظر آتے ہیں، نئ اور پُرانی بلڈنگیں ہیں۔

پھر اضطرار، محض اضطرار کی وجہ سے میں نے پھر چشمہ پہن لیا۔ میرے ساتھ کی سیٹ پر ایک بڑی پیاری دُلاری سی بچّی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب مجھ میں پیار اُمڈتا ہے نا، باقر بھائی، تو میں اُس کی باڑھ کو روک ہی نہیں سکتا۔ میں ہم آغوشی بھی ریچھ کی طرح سے کرتا ہوں۔۔۔ میں کسی روسی سے کم ہوں۔۔۔

میں اُس بچّی کے گالوں پر چٹکی لینے ہی والا تھا کہ فوراً مجھے کچھ یاد آ گیا اور میں نے

اپنا امڈا ہوا پیار، اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ٹھیک ہی کیا میں نے، کیونکہ اگلے اسٹاپ پہ جب بس رُکی اور بچّی اُترنے کے لیے اُٹھی تو میں نے اپنا چشمہ اُتار کر دیکھا۔ جو خاکہ میرے پاس سے گزرا وہ ایک جوان بھرپور عورت کا تھا۔ اُس کا سامنا! معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے آپ سے ایک فٹ آگے چل رہا ہے۔ میں اپنی اضطراری عقل سے بچا، باقر بھائی، نہیں تو اس رات میں پِٹ گیا تھا۔

مزے سے بیٹھا میں یاد کے منہ میں اُس خوبانی کو پپول ہی رہا تھا کہ بس کنڈکٹر کی آواز آئی۔۔۔ ''ارے ارے۔۔۔ مشٹیک ہو گیا، سالا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ ''ورلی ناکا تو تین اسٹاپ اُدھر رہ گیا۔ اب ہم پربھادیوی کے بیچ ہوتا۔''

''کنڈکٹر؟'' میں غصّے سے اتنا ہی کہہ سکا۔

''اُترو، اُترو۔۔۔ لو کر۔۔۔'' وہ بولا۔ ''وہ سامنے اسٹاپ ہوتا، الٹا بس کا۔ چیکر آ گیا تو جیاستی پیسا دینے کو پڑیں گا۔۔۔''

جیسے کنڈکٹر نے میرا ہاتھ پکڑ کر بس پہ بٹھایا تھا، ایسے ہی پکڑ کر نکال بھی دیا۔ بس چل دینے کے بعد مجھے گالی یاد آئی۔ ایسا ہوتا ہے نا باقر بھائی؟

میں گھر کیسے پہنچا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اپنے گھر کے بجائے دوسرے گھر میں غلطی سے گھُس جانے کی جو خوشی ہوتی ہے، مجھے تو وہ بھی نہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر پاؤں کو آنکھیں بنا کر سیڑھیاں چڑھا۔ جس دروازے کو میں اپنا سمجھا تھا، وہ اپنا ہی نکل آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں سیدھے کرسی پہ جا بیٹھا۔ تم تو جانتے ہو، اندھے کو بھی اپنے گھر کے سب موڑ توڑ کا پتا ہوتا ہے۔ بیوی کو بات بتائی تو اُس نے اس امریکن کو بہت گالیاں دیں۔ لیکن مجھے یوں لگا جیسے تصوّر میں اسے پھولوں کی چھڑی سے مار رہی ہے، کیونکہ عورت کی گالی میں وہ بات کہاں ہوتی ہے جو مرد کی گالی میں ہوتی ہے۔

اُس رات اور تو کچھ نہیں ہوا، باقر بھائی۔ میں نے عادت سے مجبور پھر چشمہ آنکھ پر رکھ لیا۔ جیسے ہی مُڑ کے دیکھا تو ایک بڑی پیاری، دُلاری سی گُڑیا عورت باہر جاتے، اندر آتے دکھائی دی۔ ہے بھگوان! وہ میری ہی بیوی تھی؟ تم تو جانتے ہو نا، باقر بھائی، للتا ایک عام روسی عورت کی طرح سے موٹی تازی ہے، اس کی کمر کمرہ ہے، لیکن اب۔۔۔ یہ سالے امریکی کیا پلک جھپکتے میں ستّر مِلی میٹر سے آٹھ مِلی میٹر کا پرنٹ بنا لیتے ہیں! میں نے بانہہ پسار کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

جانے کب سے پیار کے لیے ترسی ہوئی، اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ وہ مزاحمت بھی، جو عورتیں بہت دیر تک پیار نہ کیے جانے کے غصّے میں کرتی ہیں۔ شاید اُس نے سوچا کہ انکار کیا تو یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ یہی نہیں۔ اُلٹا شاید عورتوں کا سال منانے کے سلسلے میں اُس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا اور دھیرے دھیرے۔۔۔ اُسے معلوم ہونے لگا کہ کوئی چیز اُس کے پیار کے راستے میں آ رہی ہے اور جلدی ہی اُسے پتا چل گیا۔ وہ بولی۔۔۔ ”تم چشمہ کیوں نہیں اُتارتے؟“ میں نے ایک دم اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا۔۔۔ ”خبردار!“

اتوار کے دن ساؤتھ بمبئی بند ہوتا ہے، مگر نارتھ۔ دادر، باندرہ کا علاقہ کھُلا رہتا ہے۔ آدمی چاہے تو ارجنٹ آرڈر دے کر دوسرا چشمہ بنوا سکتا ہے، لیکن انسان کو اتنی سادہ سی حقیقت بھی کون سمجھائے کہ چشمے تک پہنچنے کے لیے بھی تو چشمہ چاہیے، یا سورداس کے آشرم کا کوئی کرمچاری۔ اور پھر کون اتنے خرچ کا متحمل ہو؟ ہمیں ڈالروں کے حساب سے تنخواہ تھوڑے ملتی ہے؟

میرا اتوار جیسے گزرا، اُس سے تو شُکر، جمعہ ہی ہزار درجے اچھا تھا۔ وہی تمہاری

بات کہ گئے تھے روزے بخشوانے، اُلٹی نماز گلے پڑی۔ اور پھر آپ سے دہریے، سینیچر اور اُس کے کوپ کو بھی نہیں مانتے، کوئی مانے بھی تو اُس کا کیریکٹر شیٹ خراب کر دیتے ہیں، جس سے ترقّی رُک جاتی ہے۔۔۔

آدھا دن تو میرا یہی بات سوچنے میں گزر گیا کہ اُس کارڈ انڈکس کا دن کیسے گزرا ہو گا؟ انڈکس کی نوب ڈھونڈنے کے لیے بھی تو چشمے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اگر وہ نوب اُسے ہُڈسن کار کا وِھیل معلوم ہونے لگے، تو وہ اپنا ہاتھ کھینچ لے گا۔ جانے اسے کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہو گا؟ ہو سکتا ہے کہ اُس کے پاس اسپیئر چشمہ ہو، کیونکہ وہ امیر آدمی ہے۔ مگر اگلے روز پتا چلا کہ اُس کے پاس اسپیئر تھا لیکن چند ہی دن پہلے اُس ہاتھی کے انڈے نے، اپنا ہی پاؤں اپنے اسپیئر پہ رکھ دیا اور وہ کرچ کرچ ہو گیا۔

دوسرا وہ بنوا نہ سکتا تھا، کیونکہ اُس کا آپٹیشن بھی ساؤتھ بمبئی ہی میں تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ غلطی کا پتا چلتے ہی وہ لِٹل ہٹ، پہ لوٹ کے آیا کہ شاید مجھے میری غلطی کا پتا چل چکا ہے۔ اگر دو غلطیاں مل کر ایک ٹھیک نہیں ہو سکتیں، تو ایک غلطی دوسرے کے ساتھ تبادلے میں تو ٹھیک ہو سکتی ہے۔ میں نے تو خیر اِس

لیے بھی پروانہ کی، کیونکہ اس چشمے میں مجھے اپنی غلطی بہت چھوٹی معلوم ہو رہی تھی اور میں چاہتا تھا اسے پتا چلے کہ اُس کی غلطی کتنی بڑی ہے۔

منیجر سے مِنّت کر کے مبادا کے انداز میں اُس نے لِٹل ہَٹ میں جھانکا، وہاں سب کچھ عظیم الشان تھا، لیکن میں نہیں تھا۔ اگر میں ہوتا تو اسے انسان کی انا کی طرح سے جِن دکھائی دیتا اور وہ بے ہوش ہو کر گر جاتا۔ لِٹل ہَٹ میں سے مریانا کی آواز، صرف آواز آرہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ گا رہی ہے۔۔۔

تم میرا چشمہ لے آئے ہو، اچھا کیا، اچھا کیا۔۔۔۔۔

اندر اُس کارڈ انڈکس، اس کمپیوٹر کو کچھ گلابی، کچھ گِرے دھبّے سے دکھائی دیے اور پھر ایک کالا دھبّا جو مسلسل ہِل رہا تھا۔ اُس نے بھی اضطرار میں چشمہ لگایا تو ایک دَم الٹا بھاگ نکلا، کیونکہ وہاں لِٹل ہَٹ میں، وہ کوئی بھینس لے آئے تھے اور وہ ناچ بھی رہی تھی!

تھی وہ مریانا۔۔۔ میرے چشمے کا مہربانا!

اپنے خوف، اپنی جھلّاہٹ میں اسی مبادا کے انداز میں وہ اپنے آپٹیشین کا پڑیا کی

دُکان کے سامنے سے بھی گزر گیا کہ شاید دُکان کی چِنک میں سے کوئی روشنی کی کرن نظر آجائے۔ لیکن کاپڑیا کی دُکان اور بھی بند دکھائی دے رہی تھی۔ ایک تو اس لیے کہ وہ واقعی بند تھی، دوسرے اس لیے کہ وہ اُسے دکھائی نہ دے رہی تھی۔ اور جب اُس نے میرے چشمے کو پہن کر دیکھا۔۔۔

اس مسلسل حماقت سے اسے یوں لگا کہ وہ ایسا گُلیور ہے جو جنّات کے ملک میں پہنچ گیا ہے۔ جہاں سب لوگ مل کر اُس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ڈرا سہما ہوا وہ امریکی ہندوستانی گھر پہنچا۔ شوفر اور گاڑی کی وجہ سے گھر پہنچنے میں اسے کوئی زیادہ دقّت نہ ہوئی۔ ہوئی بھی تو صرف اتنی کہ وی ٹی کا اسٹیشن، کارپوریشن کی عمارت سب پوپیائی کے زلزلے میں اُسے اپنے آپ پر گِرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ گھر کے بُلند شہری دروازے کے اندر پہنچ کر، جب اُس نے سیڑھی پر قدم رکھا تو لڑکھڑا کر گِرا کیونکہ جسے وہ تیسری سیڑھی سمجھا تھا، وہ ابھی پہلی ہی تھی۔ اُسے چوٹ بھی آئی مگر کوئی زیادہ نہیں۔

گھر کے اندر پہنچا تو اُسے ایک گدھا چھلانگیں مارتا ہوا دکھائی دیا۔ اُسے بہت تاؤ آیا۔ کیونکہ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ گدھا بھی پالتو جانوروں میں سے ہو سکتا ہے۔ آخر

اُس کی بیٹی جولی آئی اور اُس نے بتایا کہ بیک یارڈ میں جو دھوبی رہتے ہیں نا، پپّا۔ انہوں نے مجھے خرگوش دیا ہے!

میں نے تو اُس رات بیوی سے پیار کیا تھا نا باقر بھائی، لیکن اُس کارڈ انڈکس اور کمپیوٹر کی اپنی بیوی سے لڑائی ہو گئی۔ اِس لیے کہ بیوی اُسے اپنی طرف آتا ہوا وجینتا ٹینک دکھائی دینے لگی تھی۔ اور جب اُس سے بچنے کے لیے اُس نے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو اس کا سر پھٹ گیا، کیونکہ جسے اُس نے دروازہ سمجھا وہ دراصل کھڑکی تھی۔

سوموار کی صبح جب میں نو ساڑھے نو بجے، اپنے اندازے کے مطابق لِٹل ہَٹ کے باہر پہنچا تو وہ چوہا میرا انتظار کر رہا تھا، اپنی بچّہ گاڑی میں۔۔۔ میں امن کے انداز میں آگے بڑھا۔ وہ جنگ کے خوف سے پیچھے ہٹ گیا، لیکن تھوڑی دیر میں سمجھ کے اوپر آجانے سے ہم دونوں نے چشمے اُتارے اور دو بھوتوں کی طرح سے ایک دوسرے پر بڑھے، بغیر کچھ کہے سُنے چشمے بدلے۔۔۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ معاف کیجیے، کے سے جملے دُہرا رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا، میرا قصور ہے۔ میں کہہ رہا تھا نہیں، میری حماقت۔۔۔ پھر اس نے

بتایا کہ کل چشمے کے بغیر اس پہ کیا بیتی۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ایسا لگنے لگا کہ وہ میں تھا۔۔۔ یا شاید میں وہ۔۔۔

میں نے جلدی سے کہا۔۔۔ "یا اللہ" اور کان لپیٹ کر چل دیا۔

بولو

”بولو“ انسپکٹر گپتے نے عاجز ہو کر کہا۔

اس کی آواز اب باز گشت ہو کر رہ گئی تھی، بلکہ ٹھیٹ رلائی۔ جب اس نے ملزم سے پوچھا۔ ”کون تھا اس قتل کے پیچھے؟“

ملزم ونائی (ونائیک) بدستور خاموش تھا۔

گپتے اور اس کے ساتھی اجگاؤنکر وغیرہ نے ونائی پر تیسری ڈگری کے سب گُر استعمال کیے تھے، اور اب وہ ڈر گئے تھے کہ کہیں مار کے نشان ملزم کے بدن پر رہ

گئے، تو وہ خود دھر لیے جائیں گے۔ ریمانڈ کے چودہ دنوں میں سے صرف تین دن باقی تھے، جب کہ اُنہیں ونائی کو چارج شیٹ کے ساتھ میٹروپالیٹن مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا تھا، جو خود شکل ہی سے قاتل معلوم ہوتا تھا۔ قتل کے پیچھے سازش کا ثبوت فراہم کرنے کے سلسلے میں گپتے اور اجگاؤنکر کی ہر تفتیش اندھی کالی راہوں سے ٹکرا کر خاک و خون اُڑاتی، روتی، چلاتی، ونائی ہی پر لوٹ آتی تھی۔

پیلا چوکی کا یہ پولیس اسٹیشن راجدھانی کے معمار لیوٹنس نے نہیں، کسی مقامی ہونّق نے بنایا تھا اور اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کہیں ہوا کا رُخ حوالات کی طرف نہ ہو۔ فضا میں رطوبت اس کی سیلن کا باعث ہے۔ پھر اور باتیں۔۔۔ تادیب، تھرڈ ڈگری وغیرہ۔ اب تک ان دیواروں پر ہیبت کے نقشے بن چکے تھے۔ انسان کے اندر کا ڈر باہر آ کر دیواروں پر مصوّر ہو گیا تھا۔ ان تجریدی تصویروں کے سامنے چینی، جاپانی ڈریگن، تبتّی مہاکال، افریقی بیہولا وغیرہ کچھ بھی نہ تھے۔ چھت پر جو شکلیں بنی ہوئی تھیں، انہیں دیکھ کر تو کوئی معصوم سے معصوم بھی چِلاّ اٹھتا۔۔۔

"گلّو کو میں نے مارا ہے، حسن توبہ کا قتل میں نے کیا ہے۔ توبہ۔۔۔"

کرسی جس پر گپتے بیٹھا ہوا تھا، اس کا ایک بازو غائب تھا اور جہاں اجگاؤنکر براجمان تھے، اس کے دونوں۔۔۔ وہ دونوں بازو، دایاں اور بایاں، یا تو ونائی پر استعمال ہوئے تھے اور یا پھر ملکی سیاست میں حصّہ لینے چلے گئے تھے۔ اوپر ہزار واٹ کا ہنڈا اور ایسی کچھ اور چیزیں جمہور کی طرح نَو تھیں۔

حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے حبس باہر جھانک رہا تھا، جہاں ہال میں ڈیوٹی آفیسر تین چار غنڈوں کا بیان لے رہا تھا۔ وہ عادی مجرم ایک عجیب قسم کی بے نیازی سے بیٹھے پورے انسانی جُرم سے منکر ہو رہے تھے۔ گویا وارداتیں انہوں نے نہیں، ہم زادوں نے کی ہیں۔ ایک تو بار بار اپنا ہاتھ ران پر مارتا تھا، جیسے پہلوان لوگ اکھاڑے میں اترنے سے پہلے چیلنج کے انداز میں مارتے ہیں۔ کوئی ننگا ہو اور اپنی برہنگی کا احساس رکھے تو ہر آتا جاتا اسے دیکھتا ہے، لیکن اگر وہ اپنی اس صورت پر شرمائے نہ لجائے، اُلٹا ڈھٹائی سے دوسروں کو دیکھتا جائے تو سب کی نظر نیچی ہو جاتی ہے۔ کانسٹیبل، میٹروپالیٹن بمبئی کے نیلے بھوت، ہتھکڑیوں کے پس منظر میں بیکار، صرف حکم کے منتظر تھے۔ ان کا بس چلتا تو ہر شہری کے

ہاتھوں میں وہ لوہے کا زیور پہنا دیتے۔ محرّر کا قلم جسے ہر وقت خارش رہتی تھی، دوات میں ڈوب رہا تھا اور وہ خود بے کار بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا اور ایف، آئی، آر کا رجسٹر ان سب لوگوں کے کرم خوردہ مسوڑھوں اور جبڑوں کی طرح سے کھُلا سامنے میز پر پڑا تھا۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔ بے کار کی کِن مِن کِن مِن۔۔۔۔۔۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بغیر کسی وجہ، کسی سازش کے ونائی ایک خوبصورت نوجوان عورت کا قتل کر دے؟ ایشے (یشو وہا) کے گلے میں منگل سُوتر، ناک میں پھُلّی، بانہوں میں چوڑیاں جوں کی توں موجود تھیں۔ کارونر کی رپورٹ میں جبر تو ایک طرف کسی جھپٹ کا بھی اندراج نہ تھا۔ کوئی نئی یا پُرانی دشمنی بھی ثابت نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ ایشے وڈالہ کے نمک والے، بیرک نما کوارٹروں میں اپنے شوہر نارائن اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی، جب کہ ونائی اس سے فرسنگ پرے۔۔۔ ورلی کے کولی واڑے میں، جہاں بومِل مچھلی کی بُو چوبیس گھنٹے انسان کے جسم و ذہن کا احاطہ کیے، اس کے پور پور میں بس جاتی۔۔۔ ونائی کی محبوبہ شکو ڈالے کے پاس رہتی تھی البتّہ۔۔۔ انیٹوپ ہِل کے نیچے، ہاربر برانچ کی ریلوے لائن کے

بازو میں، جہاں بے شمار جھونپڑیاں برسات اور تڑاکے کے میل جول سے جیسے اپنے آپ اُگ آئی تھیں۔ مگر اس کا ایشے سے کیا تعلّق؟

ایشے اور اس کا میاں برہمن تھے۔ شکو اور اس کے ماں باپ کولی، جو ڈاکٹر امبیڈکر کی شہ پر بدھ ہو گئے تھے۔ اس پر بھی نہایت ہی لا پذیر ہندو سماج، انھیں عزّت سے بلانے کی بجائے بدھو کہتا تھا۔ موقع پڑتے ہی ان کی جھونپڑیاں تک جلا ڈالتا۔ انھیں جسمانی اور روحانی عذاب پہنچاتا۔ گویا بدھ ہو جانے پر بھی یہ لوگ اَچھوت کے اَچھوت ہی رہے۔ حالاں کہ تاریخ کے دھندلے ادوار میں انھی کولی، ماہی گیر لوگوں کی ایک حسینہ مکس گندھا نے پانڈوؤں کے باپ سے شادی کی تھی اور آج جن لوگوں کے سامنے ہمیں سر جھکانا پڑتا ہے، اُن کی ماں بنی تھی۔۔۔ پھر نارائن کا رقیب بھی نہ تھا کوئی۔ البتّہ الزام ہی لگانا، قانون کو پدانا ہو، تو ہر آدمی اس مرد کا رقیب ہوتا ہے، جس کی عورت ایشے ہو!

ایشے معمول کی طرح گنپتی وسرجن کے لیے مرد عورتوں کے ساتھ سیوڑی والے ساگر کی طرف گئی تھی۔ بھوکے، ننگے لوگ۔۔۔ پیٹ میں پاپڑی نہیں، تن پہ چیتھڑا نہیں۔ مگر جا رہے ہیں۔ ناچ اور گا رہے ہیں، چاہے سوکھا ہو چاہے برسات،

وہ خود نہیں، بیوڑہ اُنہیں گھسیٹے لیے جا رہا تھا شاید۔ اور یا پھر مذہبی جوش، جو بیچ میں جنون ہو ہو اُٹھتا تھا۔ جب وہ کسی کی بھی بے عزّتی کر دیتے۔ اندر کی کسی جلن سے کاروں کے شیشے توڑ دیتے اور کسی کی مجال نہ تھی انہیں کچھ کہنے کی۔ کیسے کہتے۔ کیونکہ پوری قوم، قومیت تھی ان کے پیچھے تھی اور شِو سینا۔۔۔ جیسے محرّم میں تعزیہ نکالنے والوں کے پیچھے پوری شیعہ قوم نہیں ہوتی؟ آٹھ بازوؤں والی دُرگا کے پیچھے بنگالی نہیں ہوتے؟ چاہے وہ گھاس ہوں یا نکسل باڑی؟ ایسے ہی جیسے بیوڑہ بنانے اور بیچنے والوں کے پیچھے انڈر ورلڈ ہوتی ہے، مافیا ہوتا ہے، ایک معمولی سے ٹریفک کانسٹیبل کے پیچھے پوری سرکار ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ونائی کے پیچھے صرف ونائی ہو؟

ایک، بے آڑ، غیر مامون جذبے تلے گنپتی وسرجن والے مورتی لے جاتے، ناچتے گاتے ہوئے جا رہے تھے۔۔۔ گنپتی بابا مُوریا، پڑچے ورشی لَو کر آ۔ یعنی کہ اگلے برس جلدی آ۔ مگر یہ پرارتھنا تو پچھلے اور اس سے پچھلے برس میں بھی کی تھی ان لوگوں نے، پھر سمپتی دینے والے گنپتی بابا نے کیا دیا تھا انہیں؟ کِس کِس کے گھر بھر دیے تھے؟ اُلٹا اس کی لمبی سونڈ اور پھیلی ہوئی توند کو دیکھ کر یوں

معلوم ہوتا تھا، جیسے سب کے حصّے کا وہ خود ہی کھا گیا ہے۔ ایرانی ہوٹل والے راشٹر پتی کی سفارش سے ایک پاؤ دیتے تھے۔ شکر بازار سے یونہی غائب ہو گئی تھی۔ گھاسلیٹ کے لیے میل میل، ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے کیو لگتے تھے۔ اس کی نایابی کی وجہ سے گھروں میں چولھے جلنے بند ہو گئے تھے۔ کوئی زمانہ تھا عورت سونے کی کوئی چیز یا اچھی سی ساری دیے جانے پر اپنا سب کچھ دے بیٹھتی تھی، لیکن اب وہ گھاسلیٹ کے چھوٹے سے ٹِن پر چلی آئی تھی۔۔۔

گنپتی بابا مُوریا، کے وِرد سے یہ لوگ تھک جاتے تو کسی زٹل قافیے پر چلے آتے، جو پوری زندگی ہو گیا تھا۔ پاؤڈر والے دُودھ کی بالائی مار گئی! اور پھر 'مار گئی' کی مناسبت سے وہ اس کی بے شمار گندی گردانیں کرتے ہوئے چلتے۔ بھیگی ہوئی چھوکریوں کے نمایاں پچھواڑوں کی چُٹکیاں لیتے، اپنے اور ان کے اگاڑے مشتعل کرتے۔۔۔ ایشے بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس کا بدن جو ایک ہی مرد کے مسلسل مماس سے سو گیا تھا، جاگ جاگ اُٹھتا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ پڑچے برس تو ایک طرف، پڑچے پل ہی میں ونائی کا رام پوری چاقو اس کے آر پار ہو گا اور یہ انوکھا مماس اسے کہاں سے کہاں پہنچا دے گا، اور اس غریب کا اپنا

وسرجن پانی کی بجائے آگ میں ہو گا۔ ساگر میں کا بڑوانل کہتا ہے، آگ پانی سے بھی بڑی ہے۔ کیا معلوم؟

بائیس چوبیس کی ہو گی ایشے۔ یعنی اس عمر کی جس میں کہ ہر عورت اپنے وجود ہی سے کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں ہوں۔ مغربی گھاٹ کی پیداوار ہونے کی وجہ سے سب ناریل اور ان میں کا سارا کھوپڑا اس کے بدن کو بنانے میں لگ گیا تھا۔ پھر کیا کیا گولائیاں، بالائیاں چلی آتی تھیں اس پر۔ اوپر کچھ ولندیزیوں، عربوں کا خون مل گیا تھا، جو بھارت کے پچھمی ساحل پر تجارت کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کے کارن نہ صرف ایشے کا رنگ سُرخ و سپید تھا، جلد ریشمیں، بلکہ آنکھیں بھی عرب ساگر کی طرح سے زمرّدیں ہو گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جب نارائن کو اس کی لاش ملی، تو وہ اسے اپنے نمک والے کوارٹروں میں لے آیا۔ سب تماشائیوں کو ہنکال کر اس نے ایشے کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور قریب ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے ساتھ اکیلا رہا۔ جب دروازہ کھلا تو لوگوں نے دیکھا۔ ایشے دُلھنا پے کا کاشٹا لگائے پڑی ہے، اُس کی ناک میں پھُلّی کی بجائے کھڑا ہے، پاؤں کی انگلیوں میں بچھوا۔۔۔

کتنا پیار کرتا تھا نارائن اس سے۔ شادی کے بعد ایک بار جب ایشے مائیکے گئی تو کسی نے پوچھا۔۔۔ کَے دن رہ گئے بہو کے آنے میں؟ نارائن نے تُرنت جواب دیا۔۔۔ بیس دن اور اکیس راتیں!

جب نارائن مُسکرا بھی نہ رہا تھا۔۔۔

اب ایشے کی ارتھی نکلی تو وہ رو بھی نہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو کہاں چلے گئے تھے، یہ کیا معلوم۔ ابھی اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سب اڑوس پڑوس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اپنے سُرخ کاشٹے، کفن میں ایشے اور بھی گوری چٹی لگ رہی تھی۔ وہ ایک ایسی نیند سو رہی تھی، جو شبِ زفاف میں دلہن چار چھ بار نکل جانے کے بعد سوتی ہے۔

ارتھی اُٹھ جانے کے بعد اس کے بچّے۔۔۔ ناتھو اور سبھا بار بار پوچھتے تھے۔۔۔

”آئی کُٹے؟(ماں کہاں ہے؟) اور ایک راشٹر بھاشی جواب دیتا، آئی تو گئی۔۔۔ ایسی معمولی سی ترکیب وضع کر لینے سے اس کی لسانی شہوت تسکین کو پہنچ جاتی۔

صرف دو دن رہ گئے تھے ریمانڈ میں، جب کہ انسپکٹر گپتے نے ونائی کی تفتیش کا آخری پتھّر مارا۔ ونائی اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اس کے ہونٹ تھوڑا بھنچ کر فوراً ہی معمول کے ہو گئے۔ ایک ٹھنڈے غصّے میں جانے وہ کیا کچھ پی گیا۔ گرم غصّے میں آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور شریانوں کی گانٹھیں، ان میں سُرخ دھبّے، خون کا دباؤ ایکا ایکی بڑھ جانے سے تنفّس گھُڑ چال ہو جاتا ہے۔ نتھنے پھولنے لگتے ہیں، ہونٹوں پہ کف چلی آتی ہے، بدن کی رگیں اور پٹھے تن جاتے ہیں، کوئی نئے اور ممکن وار اپنے اوپر لینے کے لیے۔ مگر وہ۔۔۔ ونائی، رنگ کا کالا، بدن کا کھردرا، جات کا کولی، جیسے گوشت پوست سے نہیں، کسی عقیدے کی فولاد سے بنا تھا۔ جسمانی یا روحانی مار کا اس پر کوئی اثر ہی نہ تھا۔ اس سارے سلسلے میں یا تو وہ آگے کی بہت سی صدیاں گن گیا تھا اور یا پیچھے کی۔ وہ دلت پنتھروں کے ساتھ فلرٹ کرتا تھا اور کبھی کبھی شِوسینا کے رسالے "مارمِک" میں کسی دوسرے نام سے لکھتا بھی تھا۔ اس وقت وہ تخفیف کے انداز میں کھڑا تھا، جیسے کوئی بھگت سنگھ دیس کی آزادی کے لیے پھانسی لگنے جا رہا ہو۔۔۔ الٹا اس کی آنکھیں کچھ اور سپیدی پکڑ گئی تھیں، کفن کی تہوں میں چھپی ہوئی نیلاہٹ اُمڈ آئی تھی، جن میں ساگر ڈوب رہے

تھے، اپنے اندر پوری لوکائی کا وسرجن لیے ہوئے۔ اس کا غصّہ اوپر اور اوپر، لاشُعور کی تہوں میں جا چھپا تھا، جہاں ساری خدائی ملتی ہے اور وہ۔۔۔ غصّہ، کسی ایک فرد کا ہو کر رہ جانے کی بجائے پورے اجتماع کا ہو جاتا ہے۔۔۔

باہر آج بھی بارش ہو رہی تھی اور انسان کے نفس، اس کی سائیکی کا بیڑا غرق کر رہی تھی۔ کہاں تو پورے جولائی اور اگست کے مہینے خالی گئے تھے اور کہاں اب ستمبر کے آخر میں یوں لگ رہا تھا، جیسے ورن دیوتا بیئر کے کیگ کے کیگ پی کے دنیا کو اپنی چھوٹی حاجت کا شکار بنا رہا ہے۔ خریف کی فصل تباہ ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا فارسی نہ جاننے کی وجہ سے ربیع اور خریف کے معنی نہ سمجھتا تھا۔ فصلوں میں اسے کوئی تمیز نہ رہی تھی۔ وہ تھوڑا ہبرو، تھوڑی سنسکرت اور عربی میں شُدبُد رکھتا تھا اور بس۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے ایک ہی زبان آتی ہے، جس کا نام ہے۔۔۔ آہ!

جب سرکار کے میٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ، خدا کے نمائندے بنے، ایک بلیٹن شائع کر دیتے۔ خلیج بنگال میں ایک ٹرف، ایک کونڈا پیدا ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ٹائیفون بن کر اڑیسہ کے بے شمار گاؤں کو تباہ کرتا ہوا ذہن کینل کے ضلع کی

طرف نکل جائے۔ (جہاں کھاد کا کارخانہ ہے) اور یا پھر مدھیہ پردیش سے مراٹھواڑ، بمبئی کی طرف چلا جائے۔ کچھ علاقوں کو تو وہ باڑھ سے برباد کر گیا، اور کینول میں سوکھا بو گیا اور لوگوں کو اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے چھوڑ گیا کہ ان کے لیے بھوکا مرنا اچھا ہو گا، یا ڈوب کر جان دینا؟ چاروں طرف ہاؤ ہو کا نقارہ بج رہا تھا۔۔۔ بے زبان، بے سُر، بے تال۔

اور ونائی چپ تھا۔ چُپ، صابر جابر کے سامنے تن جائے تو بڑے بڑوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ سازش کی تفتیش کے سلسلے میں گپتے اتنا تنگ آ گیا تھا، کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ پیٹی اور پتلون اُتار کر ونائی کے سامنے لیٹ جائے۔۔۔ اسے ریمانڈ کے پہلے چند دن یاد آ رہے تھے، جب اس نے ونائی سے پوچھا تھا۔۔۔

"تم نے ایشے کو کیوں مارا؟"

ونائی نے یونہی سا سر ہلا دیا۔ جس کا مطلب تھا، ایسے ہی۔

"اس لیے کہ وہ اونچی جات والی تھی؟"

"نہیں۔"

”امیر عورت تھی؟“

”نہیں۔“

”خوب صورت اور جوان تھی؟“

”نہیں، نہیں، نہیں“ ونائی نے قدرے برافروختگی سے کہا۔ ”شکوُ اس سے کہیں زیادہ سندر، کہیں زیادہ جوان ہے۔“

”شکو؟“ گپتے نے اپنی کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”وہ کالی کلوٹی کولی چھوکری، جو آٹھ آٹھ آنے میں۔۔۔“

اس سے پہلے کہ گپتے اپنی بات پوری کرتا، ونائی ایک دم اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”باسٹرڈ!۔۔۔ تمھاری بہن سے اس کا ریٹ زیادہ ہے۔۔۔“

یہ وقت تھا، جب کہ گپتے نے ونائی کو پہلا اور بھرپور تھپڑ مارا۔ اس کی انگلیاں اس نوعمر مگر سرکش لڑکے کے گالوں میں کھُب گئیں، وہ ہل نہ سکتا تھا کیونکہ حوالدار اور کانسٹیبل لوگ مضبوطی سے اسے پکڑے ہوئے تھے۔ ونائی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، نہ ہی انگلیوں کے نشان آئے؟

گپتے نے اپنے سینیئر اجگاؤنکر کی طرف دیکھا۔ ونائی بولتا چلا گیا۔۔۔ ”دنیا کے نائنٹی نائن پرسینٹ لوگ اگر ایک ٹکے میں بکتے ہیں، تو تم آدھے میں۔۔۔ وہ سب دلت جاتی کے ہیں۔ رنگ کے کالے، پر صحت والے۔۔۔“

جبھی گپتے نے کرسی کا بازو کھینچا اور پے در پے ونائی پر برسانا، اسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد ونائی لڑکھڑایا اور پھر ان سب کے سامنے ڈھیر ہو گیا اور یوں اس تفتیش کا پہلا سیشن ختم ہوا۔

رات مرہم پٹّی ہو جانے کی وجہ سے ونائی ہوش میں آ چکا تھا۔ پوری رات وہ سیلے فرش پر پڑا رہا۔ کپڑے پھٹ جانے کی وجہ سے وہ کچھ ڈھکا، کچھ ننگا، مغربی گھاٹ کا کوڑیالا کوبرا معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے فرش پر رات کی دو سوکھی روٹیاں پڑی تھیں جو اب تک پاپڑ ہو گئی تھیں۔ دال کے کٹورے میں سماروع قسم کی ایک سفید سی جھلّی چلی آئی تھی۔ اور جب وہ ختم ہوئے تو ونائی کو کاٹنے لگے۔ چیونٹوں نے جب دیکھا کہ اسے کاٹنے سے وہ خود ہی مرنے لگے ہیں، تو بھاگ کر چینوٹیالہ میں دبک گئے۔

انسپکٹر لوگ آئے۔ ان کے چہروں کی رگیں اور پٹھے کچھ ارادوں سے تنے ہوئے

تھے۔

"ونائی۔" اجگاؤنکر نے پکارا۔

ونائی اٹھا، گِرا، پھر اُٹھا اور اپنا کوبرئی پھن تان کر اجگاؤنکر کو درست کرنے لگا۔۔۔ "ونائیک راؤ۔۔۔ ونائیک راؤ۔۔۔"

"اوکے۔۔۔ اوکے۔" اجگاؤنکر نے اپنے بید کو بغل میں اڑستے ہوئے کہا۔۔۔ "مسٹر ونائیک راؤ۔۔۔"

"That's Right" ونائی نے کہا۔ اس کے چہرے پر اب نفرت کا ایک احساس تھا، بازو کے ایک جھٹکے سے اس نے گردن پر رات کا لگا ہوا پسینہ اور میل پونچھا اور اجگاؤنکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

اجگاؤنکر نے پوچھا۔۔۔ "تم ہوٹل نیرج کے پروپرائٹر کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔" ونائی نے جواب دیا۔ "ہاں ایک بار کھانا کھایا تھا اُدھر۔"

"تم جانتے ہو، جوزف پریرا، اس کا پروپرائٹر، ٹاؤن کونسلر کُلکرنی اور وڈالے کے کچھ بنیئوں کے ساتھ مل کر کاجو اور فینی بیچتا ہے۔ گوا سے میرہ منگواتا ہے، فارن

سے سکا چ؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔۔۔ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کا دھندا تم مادر۔۔۔ کو ہفتہ کھلائے بغیر دو دن بھی نہیں چل سکتا۔۔۔"

اجگاؤنکر تلملا کر رہ گیا۔ بات سچی مگر یوں دو ٹوک تو کمشنر نے بھی نہیں کی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پھر گپتے کی طرف اشارہ کیا، کیونکہ یہ کیس دراصل اُسی کا بے بی تھا۔ یہ ایسے ہی تھا، جیسے کورٹ میں استغاثہ جب اپنی جرح ختم کر لیتا ہے، تو وکیل صفائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔۔۔ "یُور کیس۔۔۔"

گپتے نے کہا۔ "راؤ صحیب۔۔۔ آپ کے نالج میں ہے، جوزف پریرا ایشے پر آنکھ رکھتا تھا؟"

"آنکھ رکھتا تھا کہ ٹانگ رکھتا تھا۔۔۔" ونائی نے جواب دیا۔ "کون، کسے، کتنے دھکے لگاتا ہے۔۔۔ میں کیا اس کا اکاؤنٹ رکھتا ہوں۔"

"تمہیں پتا ہے پریرا اور علاقے کے دادا اکرم نے دادر اور پریل کے کراس روڈ

پر، جہاں مہابیر جی کا مندر رہے، ایشے کو چھاتی سے پکڑ لیا تھا؟"

"ہوں۔"

"پھر شور مچ جانے پر پریرا بھاگ گیا، مگر اکرم پکڑا گیا۔ لوگوں نے اسے مارا؟"

ونائی نے اس بات پر سر ہلایا اور بولا۔ "اس لیے مارا کہ سالوں میں خود ہمّت نہیں تھی چھاتیاں پکڑنے کی۔"

ونائی ہنس رہا تھا۔

"اس سے پریرا کی بے عزّتی ہوئی۔" گپتے نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایشے کا دھندہ چوپٹ ہو گیا۔"

"تب؟"

گپتے نے آواز کو بلند کیا۔ "تب، بدلہ لینے کے لیے اس نے ایک اجیر، ایک ہائرلنگ رکھا؟"

"ہوں۔"

”اور وہ۔۔۔ تم تھے۔۔۔ تُم۔۔۔ تُم۔۔۔“

اس سے پہلے کہ ونائی جواب دیتا۔ اجگاؤنکر نے گویا چھت ہی پھاڑ دی۔ ”کے روپوں میں فیصلہ ہوا؟۔۔۔ بولو۔۔۔؟“

”بولو“ گپتے اس کے ساتھ ہی گر جا۔

ونائی خاموش رہا۔ انسان ہمیشہ اس لیے خاموش نہیں رہتا کہ وہ مجرم ہے۔۔۔ وہ تھک بھی جاتا ہے۔

یہ وہ وقت تھا، جب آدمی اس قدر بھائیں بھائیں کرتے ہوئے خاموشی کے سامنے نہ صرف بے بس ہو جاتا ہے، بلکہ کانپنے لگتا ہے۔ نامُرادی میں، غصّے میں۔ جبھی دوسری کرسی کے بازو ونائی پر ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ اب وہ مفتوح فاتح تھا۔ اس کی ناک ہی سے نہیں، کان سے بھی خون بہنے لگا تھا۔ جو دماغ سے جریانِ کی علامت ہے۔ گپتے اور اجگاؤنکر دونوں کی چھٹی ہو گئی۔۔۔

”ڈھوکے۔“ گپتے نے گھبرائی ہوئی آواز میں حوالدار سے کہا۔ ”بھاگو۔۔۔ ناکے پر جاؤ اور برف لاؤ۔“

حوالدار ڈھوکے نے ”ہو“ کہا اور سیلوٹ کے تکلّف میں پڑے بغیر باہر کی طرف لپکا۔ پیچھے سے گپتے نے تائیدی آواز دی۔

”پوری سِل لانا۔“

دو روز بعد تیسرا سیشن ہوا۔ ونائی بچ گیا۔ جب کہ گپتے، اجگاؤنکر اور کچھ کانسٹیبل مل کر ونائی کے پھسل کر گرنے اور ِگر کر زخمی ہو کر مر جانے کا پنچ نامہ تیار کرنے کی فکر میں تھے۔ تیسرے دن ڈاکٹر آئی آئی گلاٹی کی مدد سے انہوں نے ونائی کی زبردستی فیڈنگ کی۔ طاقت کے انجکشن دیے، تاکہ اسے تندرست بنائیں اور پھر ماریں۔

یہ دیکھ کر کہ اس وقت اذیت دینا ٹھیک نہیں ہے، گپتے اور اجگاؤنکر نے پینترا بدلا۔ ونائی کے پاس آتے ہوئے اجگاؤنکر نے کہا۔

”وِنے۔۔۔“

ونائی چوکنا ہو گیا۔

”تم میرے بھائی ہو۔“

”ہوں۔“

”تمہارا گاؤں اڑوت اجگاؤں ہی کے پاس ہے۔“

”ہوں۔“

اس سے پہلے کہ اجگاؤنکر اپنا ہاتھ کسی مصنوعی میلان سے ونائی کے کندھے پر رکھتا، ونائی نے پوری قوّت سے یوں جھٹک دیا کہ وہ اجگاؤنکر کی پیٹھ سے جا لگا اور اسے موچ آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ گپتے، حوالدار ڈھوکے اور دوسرے کانسٹیبل حیران تھے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے، پہروں بھوکا رہنے کے باوجود اس چھوکرے میں اتنی طاقت کہاں سے چلی آئی؟

”میں تمہاری مار سہ سکتا ہوں۔“ ونائی بولا۔ ”پیار نہیں۔“

صاف دکھائی دیتا تھا کہ ونائی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ رہے ہیں اور کتنی محنت، کتنی مشقت سے وہ انہیں کہیں اوپر بھیج رہا ہے۔ مگر چونکہ آنسو اور جذبہ ہم زلف ہوتے ہیں، اس نے کسی رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جو بولا ہے، سچ بولا ہے۔“

''سچ کہتے ہو'' گپتے نے نرمی سے کہا۔ ''اس گھات کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ نہیں؟''

''نہیں۔''

اور پھر ونائی اپنے آپ شروع ہو گیا، جیسے کوئی صفائی یا تذکیہ چاہتا ہو۔ ''میں اسے جاتی، مت بھید کے لیے مارتا تو بدلہ لینے کی بات ہوتی، پیسے کے لیے مارتا تو چوری بیری، لوٹ مار کی۔ شریر کے لیے مارتا تو ریپ کی۔۔۔''

''ہوں۔۔۔ ہوں۔۔۔'' گپتے اور اجگاؤنکر نے ایک ساتھ کہا اور ٹوٹی کرسیاں آگے سِرکا لیں۔ وہ یک رُکنی الفاظ صرف ونائی ہی کا ٹھیکہ نہ تھے۔

''میں نے ایشے کو اس لیے مارا۔'' ونائی نے گروَ سے کہا۔ ''گنپتی وسرجن کے پورے کراؤڈ میں وہی تھی، جس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ جو بہت خوب صورت لگ رہی تھی، اور انوسینٹ۔''

پھر تھوڑی دیر کے لیے وہ رُک گیا۔ جیسے وہ رُکا تھا، ویسے ہی شروع بھی ہو گیا۔ ''میں کسی ایسے کو قتل کرنا چاہتا تھا، جو ایک دم معصوم ہو، دیوی ہو، دیوتا ہو۔۔۔''

گپتے اور اجگاؤنکر کے چہروں پر ابتری پھیل گئی۔ اب جو انہوں نے کہا، وہ الفاظ کی مشت زنی تھی۔۔۔ ”تمہیں پتا تھا، ایشے کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ نا تھو، سلبھا؟“

”۔۔۔اور صرف ایک پتی۔“ ونائی نے جیسے پورے عمرانی نظام پر چوٹ کی۔

کچھ دیر خاموشی حکومت کرتی رہی۔

”تم دِلت پینتھر ہو؟“ آخر اجگاؤنکر نے اس سکوت کو توڑا، قانون شکنی کی۔ ونائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوال کو جواب کے قابل نہ سمجھتا تھا۔

”کرانتی کار؟“ گپتے نے تضحیک کے انداز میں کہا۔ ”بلیک پینتھر؟ چے گوارا کے پیرو؟ الفتح۔۔۔“

”میں ان سب کا باپ ہوں۔“ ونائی ایک دم ایکسائٹ ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک بے قصور کو مارا ہے۔“ اور پھر اسی دم بولا۔ ”ان کا باپ اور تمہارا پوھنا (داماد)۔“

گپتے اُچھل گیا، مگر اجگاؤنکر نے اپنی مضبوط بانہوں سے اسے دبا دیا اور بولا۔

”جانتے ہو تمھارے جُرم کی سزا موت ہے؟“

ونائی نے سر ہلایا۔ ”اسی لیے تو یہ سب میں کیا ہے۔۔۔ تم مجھے مارنا چاہتے ہو اور میں مرنا چاہتا ہوں۔ بولو، جیت دونوں میں کس کی ہوئی؟۔۔۔ بکواس یہ ہے کہ اب تم میرے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی مارنا چاہتے ہو۔ جیسے ایک آدمی کے مارنے سے تمہارے قانون کی کھُجلی دور نہیں ہوتی۔“

اور یہاں سے ونائی کا ٹھنڈا غصّہ ایک واضح شکل اختیار کر گیا، کیونکہ اس کا چہرہ بے رنگ تھا، کسی قسم کے تاثر سے عاری، جب کہ گپتے نے کہا۔۔۔ ”مروگے تو پتا چلے گا، مرنا کیا ہوتا ہے؟“

”What a Donkey?“ ونائی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ گپتے اور اجگاؤنکر نے اوپر سے ہزار واٹ کے ہنڈے کی روشنی ونائی پر پھینکنا شروع کر دی اور بھی بہت سی چیزیں تھیں پوچھنے کی خاطر کے لیے۔

دنیا کے کسی نہ کسی حصّے پر ہر سال، ہر وقت برف پڑتی ہے۔ ابھی وہ پگھل بھی نہیں پاتی کہ اس پر اور برف پڑ جاتی ہے اور وقت کو منجمد اور قوسل بنا دیتی ہے۔

ونائی کی دنیا کا نقطۂ انجماد اسی دن سے بسیط ہونا شروع ہو گیا تھا، جب کہ وہ کولی ماں باپ کے گھر پیدا ہو گیا۔ وہ ساڑھے چار سال کا تھا جب کہ اس کا باپ، رتنا کولی، ریڈ سگنل کے باوجود اپنی ناؤ لے کر سمندر میں ٹھل گیا۔ اسی شام چاند اور نیپچو نے مل کر نہ جانے کیا سازش کی کہ رتنا کو اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔ وہی مچھلیاں جنہیں رتنا کولی کھانا، پکانا اور بیچنا چاہتا تھا، مل کر اسے ہی کھا پکا اور بیچ گئیں۔ ماں ایک سپیرے کے ساتھ بھاگ گئی اور کچھ برسوں کے بعد ونائی کے لیے تین بہنیں اور دو بھائی لے کر لوٹ آئی۔ ونائی اسکائش آرفینج میں پڑھا، جو نام ہی کا آرفینج۔۔۔ اناتھ آلیہ ہے، مگر اس میں صرف ناتھ ہی پڑھ سکتے ہیں۔ ونائی اگر وہاں پڑھا تو یہ فادر کرخانیس کی مہربانی تھی۔

وہ نقطہ اسی سال سمٹنا شروع ہو گیا، جب کہ لوگوں نے گنپتی کی مورتی گھر میں استھاپت کی اور پھل پھول اس کی سیوا میں بھینٹ کرنے لگے۔ اس دن ونائی اینٹوپ ہِل کے دامن میں شکو سے آخری بار ملا۔

شکو ہاتھ میں گولڈ فلیک کا ایک پرانا ٹین تھامے کھڑی تھی اور بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس کی زلفیں وہم کی طرح سے لمبی، آنکھیں گمان کی طرح سے

دھندلی اور بدن یقین کی طرح سے سخت تھا۔ گویا اینٹوپ ہِل کے اِدھر آبنوس سے بنی ایک اپسرا تھی اور اُدھر فولاد سے بنی اپسرا۔۔۔ ٹرام بے کاری ایکٹر۔ یہ میں ری ایکٹر کی مناسبت سے کہہ رہا ہوں کہ شکو کا پورا بدن ایک بریتا تھا، جس کی کنی کنی یورینیم تھی اور نس نس کوبالٹ۔ وہ معدنیات کی ایک کان تھی، جسے کسی نے ابھی تک پراسپیکٹ نہیں کیا تھا۔ وہ دھاتوں کا خزانہ، اسے ایک ہی دھات چاہیے تھی اور وہ بھی صرف ونائی سے۔۔۔ اسے نشچے ہو گیا تھا کہ یہی وہ مرد ہے جس کی وجہ سے اپنا آپ کم پڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جب شکو نے بتایا کہ وہ اور اس کے ماں باپ رات سے بھوکے ہیں، کیونکہ گھاسلیٹ کے نہ ہونے سے چولھا نہیں جلا، تو ونائی نے اپنے اسی یک رُکنی انداز سے کہا۔۔۔ ''ہوں۔''

''ہوں کیا؟'' شکو نے ادا سے پوچھا، جس کے جواب میں ونائی نے پھر وہی ''ہوں'' دُہرا دی، جو آواز پہلی ''ہوں'' سے مدھم تھی، کیونکہ وہ سمجھ سے تعلق رکھتی تھی۔

جبھی، اسے قدوائی روڈ پر ماٹنگا سائن کی طرف جاتا ہوا ایسو کمپنی کا ایک ٹینکر

دکھائی دیا، جس میں گھاسلیٹ تھا۔ پیچھے اس کی ٹونٹی سے مٹّی کا تیل قطرہ بہہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

ونائی نے شکو کے ہاتھ سے گولڈ فلیک کا ٹین جھپٹ لیا اور ٹینکر کے پیچھے دوڑا۔ سامنے ایک ٹرک کے آہستہ ہو جانے سے ٹینکر کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ ونائی اُچک کر اس کے پیچھے لٹک گیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے سیڑھی تھامی اور دوسرے ٹین کی ٹونٹی کے نیچے کر لیا۔ وہ چاہتا تو پھرکی گھما کر ایک ہی سیکنڈ میں وہ چھوٹا سا ٹین بھر لیتا، مگر اس نے سوچا وہ صرف وہی تیل لے گا، جو گِر کر سڑک پر ضائع ہو رہا ہے۔۔۔

شکو، کلیجے پر ہاتھ رکھے کھڑی دور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سِگنل موافق نہ ہونے سے ٹینکر تھوڑا نا کے پر رُکا اور پھر جھٹکے کے ساتھ دائیں طرف مُڑ کر سائن ماٹنگا روڈ پر ہو لیا۔ ریل کا پُل پار کرتے ہی ونائی کا ٹین بھرنے لگا۔ جبھی راشن کی دُکان پر گھاسلیٹ کے لیے لمبے کیو میں لگے ہوئے لوگوں نے دیکھا اور شور مچا دیا۔۔۔ ”چور چور۔۔۔“ ونائی کا ہاتھ سلپ ہو گیا اور وہ نیچے سڑک پر گر گیا۔ ٹینکر رُکا۔ لوگ لپکے اور ونائی کو پکڑ کر اُسے مارنا شروع کر دیا۔ ٹینکر کا

ڈرائیور اس کا کنڈکٹر ساتھی اسے گھسیٹتے ہوئے پاس ہی کے پولیس اسٹیشن کی طرف لے جانے لگے۔ ونائی کو صرف ایک ہی چوٹ آئی تھی اور وہ یہ کہ ٹین کے ساتھ گھاسلیٹ بھی نیچے گر گیا تھا۔

ونائی نے نہیں، مگر جانے کس نے شکو کا نام لے دیا۔ اس دن بہت گرمی تھی کیونکہ بادل تنے تھے، مگر چھینٹا نہیں پڑ رہا تھا۔ جبھی پولیس کا ایک آفیسر جیپ لیے انیٹوپ ہِل کی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔۔۔ 'تفتیش' کے لیے، اس نے شکو اور اس کے ماں باپ کو بتایا کہ ونائی حوالات میں ہے۔ اس پر چوری، ڈاکے۔۔۔ 'ہائی وے رابری' کے دوش لگے ہیں۔ شکو ایک تو پہلے ہی بھوکی تھی۔ اس پر ونائی کے پکڑے جانے کی بات سن کر وہ کانپنے لگی۔

"اسے مارا تو نہیں؟" وہ بولی۔

آفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے پیاس لگی تھی۔ اس کی وجہ گرمی تھی یا شکو، یہ نہیں معلوم۔ لیکن جب شکو نے گھڑے سے پانی نکال کر اسے دیا، تو اس نے لینے، پینے سے انکار کر دیا۔ شکو نے سوچا کوئی بات نہیں۔۔۔ اونچی جات کا ہو گا۔ آفیسر نے بتایا، ونائی، گھر آ سکے گا، جب کوئی اس کا ضامن بنے گا۔

شکو نے چھاتی پر ہاتھ رکھا اور بولی "جامن میں بنوں۔"

"تم؟" شکو کے باپ نے کہا۔۔۔ "تمہارے۔۔۔"

جب تک شکو غلیل کے گُلّے کی طرح سے باہر چھوٹ گئی تھی۔ آفیسر اٹھا اور شکو کے باپ کو دلاسا دیتے ہوئے بولا۔ "گھبراؤ نہیں کاکا، شخصی۔۔۔ پرسنل ضمانت بھی ہو سکتی ہے۔۔۔"

اور وہ باہر کھڑی جیپ کی طرف چل دیا۔

بوڑھے نے و تسلا، شکو کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں شک تھے۔ مگر و تسلا بائی بولی۔ "کوئی بات نہیں، جانتی نہ ہوتی تو آجائے گی۔ شکو۔۔۔"

ونائی حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے ڈیوٹی آفیسر کو دیکھ کر چلّا رہا تھا۔

"میں نے کوئی چوری نہیں کی، انسپکٹر۔۔۔ کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا۔ ٹینکر سے گھاسلیٹ ٹپک رہا تھا، سڑک پر گر کر ویسٹ ہو رہا تھا۔۔۔"

ڈیوٹی آفیسر بنیے کی طرح کسی امیر گاہک کی طرف متوجّہ تھا۔

پولیس آفیسر کی جیپ پہلے آ گئی، جس سے اُتر کر وہ پولیس اسٹیشن کے پیچھے چلا گیا۔ جہاں راستہ کوارٹروں کی طرف جاتا تھا۔ ونائی نے شکو کو دُور سے آتے دیکھا۔ وہ بھاگ رہی تھی اور اس کی گھنگھور زلفیں، پیچھے کی طرف اُڑ رہی تھیں، کہیں برسنے جا رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد ایک کانسٹیبل نے حوالات کا دروازہ کھولا اور کہا "ونائیک راؤ۔۔۔ باہر۔"

ونائی جو اس ارتقا کے لیے تیار ہی نہ تھا، بولا۔۔۔ "کیا مطلب؟۔۔۔ کیوں، کیسے؟"

باہر آیا تو اس نے شکو بائی کو ڈیوٹی روم میں نہ پایا۔

"میری ضمانت کس نے دی ہے۔۔۔؟ کس نے بیل آؤٹ کیا ہے مجھے۔۔۔؟" اس نے ڈیوٹی آفیسر سے پوچھا، جس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

ونائی نے دیکھا شکو پولیس اسٹیشن کے احاطے سے باہر جا رہی ہے، اور وہ اپنی نہیں کسی اور ہی کی چال چل رہی ہے۔۔۔

اس سے پہلے کہ وہ باہر لپکتا، ڈیوٹی آفیسر نے اسے روکا اور ایک کاغذ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ''ہئی کرو۔۔۔ ۱۲ اکتوبر کو باندرا کورٹ میں حاجر ہونا مانگتا، سمجھا؟''

ونائی نے جلدی سے کاغذ پر دستخط کیے، اس کی نقل ہاتھ میں چُرمُر کی اور پھر باہر کی طرف بھاگا۔ سڑک سے اُدھر ٹریفک سگنل کے سامنے ہی ونائی نے شکو کو آلیا۔

''شکو'' ونائی نے کہا۔۔۔

شکو کچھ نہ بولی۔ وہ رو رہی تھی اور نہ ہنس رہی تھی۔ وہ اس عالم میں تھی جس میں انسان دیکھتا ایک چیز ہے اور سوچتا دوسری، اور سوال کرنے والے کی طرف مُڑ کر صرف اتنا سا کہتا ہے۔ ''ایں؟''

ونائی نے شکو کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔۔۔ ''کیا ہوا شکو؟''

''کچھ نہیں۔'' شکو نے جواب دیا۔

ونائی اس کے پیچھے ہو لیا، اور کچھ نہیں تو ٹریفک سے اسے بچانے کے لیے۔ سِگنل کے پاس پہنچ کر ایک بار ونائی نے مُڑ کر پیچھے پولیس اسٹیشن کی طرف دیکھا، جس

کی دیواریں ٹھوس کنکریٹ سے بنی تھیں۔

سِگنل کے دوسری طرف سڑک پر رُکی ٹریفک ابھی راستہ نہ دے رہے تھی۔ وہ دونوں پیراپٹ پر کھڑے تھے۔ جب کہ ونائی نے پھر پوچھا۔۔ ”شکو! بول تو سہی کیا ہوا؟“

شکو نے ایک فریادی نظر سے ونائی کی طرف دیکھا۔

”تم نے میری ضمانت دی ہے؟“ ونائی نے پوچھا۔

”۔۔۔“

”کیسے دی ہے؟ تمہارے پاس۔۔۔“

شکو نے حقارت کی نظر سے ونائی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں زبان سے زیادہ ناطق تھیں جو کہہ رہی تھیں۔۔۔ مرد کی جات کتّے کی ہے۔۔۔ وہ اگر اپنی زبان کو شرمندۂ الفاظ کرتی تو ونائی کہتا۔۔۔ کتّے کی نہیں، بھیڑیے کی۔ مگر وہ وہی بیگانی چال چلتی ہوئی سڑک پار کر گئی اور قدوائی روڈ کی پٹڑی پر ہولی۔ ونائی نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور بولا۔۔۔ ”شکو۔“

شکو پلٹ کر اُلٹ کر ونائی سے آ لگی۔ یوں معلوم ہوا جیسے وہ اس کی چھاتی پر اپنا سر رکھ کر اپنا دُکھ رولے گی، سکھ بولے گی۔ مگر نہیں، شکو نے اپنا ہاتھ چھُڑا لیا۔ اسے ونائی سے نفرت تھی، اپنے آپ سے نفرت تھی۔۔۔ وہ چل دی!

ونائی بھوچکا کھڑا رہ گیا اور شکو کو جاتے دیکھنے لگا، جس نے اپنے کاشٹے کا پلّو منہ میں ٹھونس لیا تھا اور جا رہی تھی۔ سامنے بائیں ہاتھ پر ہاسٹل، ہاربر برانچ کی ریلوے لائنیں اور انٹیوپ ہِل کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

ونائی سب جان گیا تھا، سب سمجھ گیا تھا وہ کتنا کہنا چاہتا تھا، شکو تم نردوش ہو کنواری ہو۔۔۔ انہی حالات میں سبزی بیچنے والی شانتا کو اس کے پتی نے گھر سے نکال دیا تھا اور آج وہ فارس روڈ کی جنگو بائی کے قحبہ خانے میں رہتی، دھندا کرتی ہے۔ روز رات چھ سات مرد اسے روندتے دَلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اس سے کم ہوں تو نہ وہ میڈم، نہ دلال کے پیسے دے سکتی ہے اور اسے پھیری والے کی سوکھی روٹی اور مرچ کھانی پڑتی ہے۔ لیکن وہ کنواری ہے، کیونکہ نہ اسے اپنے گاہکوں سے محبت ہے، نہ اپنے پتی سے تھی۔۔۔

ونائی کا خیال تھا، شکو آخر اسے بُلائے گی، لوٹ کر آئے گی۔ مگر نہیں۔ وہ تو اپنے

آپ کو اب وفائی کے قابل نہ سمجھتے ہوئے جا چکی تھی۔ وفائی نے آخری بار اسے اپنی نظروں کی سرحد پر دیکھا اور چِلّا اُٹھا۔۔۔ ”میں ۱۳ اکتوبر نہیں آنے دوں گا۔۔۔ میں تین اکتوبر نہیں آنے دوں گا۔۔۔“

اور اسی عالم میں وہ بھاگتا ہوا ٹانگا کی بھاری ٹریفک میں کہیں گم ہو گیا۔۔۔(تھا)

بلّی کا بچّہ

کچھ نہیں۔ کوئی کام نہیں تھا، ایسے ہی چھٹپٹا کے باہر نکل گیا تھا۔

سرحد پر لڑائی کے کارن سب کاروبار سُست ہو گئے تھے۔ زندگی میں جس ارتعاش کو ہم ڈھونڈا کرتے ہیں، وہ لڑنے کے لیے محاذ پہ چلا گیا تھا اور جو بچ رہا تھا، روزانہ اخباروں میں سمٹ آیا تھا۔ بار بار پڑھنے جانے کے باوجود آدھ پون گھنٹے میں ختم ہو جاتے تھے۔

۔۔۔ نوعمری میں ایسا ہوتا تھا۔ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ باہر نکل جاتے

تھے۔۔۔ آج کچھ ہونے والا ہے۔۔۔! ہوتا ہوا تا جب بھی کچھ نہ تھا، چنانچہ آج بھی کچھ نہ ہوا، سوائے اس واقعے کے جس کے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔۔۔

میرے ساتھ بے کاروں کی پوری کی پوری پلاٹون تھی، جیسے کوئی فوجی دستہ دشمن کی نقل و حرکت بھانپنے کے لیے نکل جاتا ہے، اسی طرح ہم بھی نکل جاتے تھے اور اِس اسٹوڈیو سے اُس اسٹوڈیو تک گھومتے رہنے کے بعد شام کو برٹورنی پہنچ جاتے، جہاں تلے ہوئے نمکین کاجو کے ساتھ چائے یا کافی کی ایک آدھ پیالی پی لیتے اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے۔۔۔ کون بِل دینے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے؟ تھوڑی دیر کے بعد، اپنی جیب کی بجائے ہم ایک دوسرے کی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگتے، جو ہوتے ہوتے گریبان تک پہنچ جاتے، آخر بِل کون دیتا؟۔۔۔ میں! بے کاری کا احساس جس کی ہڈیوں تک میں بس گیا تھا۔۔۔ باپ رے!

کوئی بے کاری سی بے کاری تھی؟

رات کو دیکھ کے دن یاد آیا

اس پہ برٹوری کی ہیریٹ کو تھینک یو بھی مجھے ہی کہنا پڑتا۔۔۔

پھر کلیان، رشی اور ہمارا عیسائی دوست، جسے ہم "جیگوار" کہا کرتے تھے، شکار کے لیے نکل جاتے، جسے وہ سیر و سیاحت کہتے۔ یہ ماں کے مار کو پولو چین تھوڑے ہی جاتے؟ بس میرین ڈرائیو پہ پہنچ کر دو، دو سو گرام گنڈیریاں چوستے، کچھ چھلکے بولے وارڈ پہ پھینکتے اور کچھ سمندر میں اور لہروں کے ساتھ انہیں واپس آتے ہوئے دیکھتے۔ یعنی ان کی ہر چیز کچھ دُور جا کر واپس آتی ہوئی دکھائی دیتی۔ پھر وہسکی کی بھولی بسری یاد میں یہ لوگ گیلی اور نمکین مونگ پھلی کھاتے۔ آخر بدمزہ ہو کر نریمان پوائنٹ پہ سولہ ملی میٹر کی پروپیگنڈا فلم دیکھنے لگتے، جس کو حکومت کسی اندیشے میں مفت دکھاتی۔ پھر گھبرا کر گھر لوٹ آتے، جہاں ان کی بیویاں ان سے دن بھر کی کارگزاری لفظ بہ لفظ سننے پہ اصرار کرتیں اور ان کے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ سمجھتیں۔ ایک حبس کے احساس کے ساتھ ان کا جی پھر باہر بھاگ جانے کو چاہنے لگتا۔

درحقیقت ہم سب کا گھر باہر ہو رہا تھا اور باہر گھر۔۔۔ جب شہر کی طرف جاتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے گھر لوٹ رہے ہیں، اور گھر لوٹتے تو یوں لگتا جیسے باہر نکال

دیے گئے۔ اس 'باہر' کی کھلی ہوا میں بیوی کے پھپھوندی لگ جاتی۔ ہاتھ لگاؤ تو ہاتھ پہ چلی آتی، جس سے گھبرا کر ہم اسے 'گھر' چلنے کا مشورہ دیتے لیکن وہ صاف جواب دے جاتی۔۔۔ گھر میں خرچ ہوتا ہے۔ ہم یہیں "باہر" اچھے ہیں۔

آج ہم پیر سین ڈیری جانے کے لیے نکلے تھے۔ اگر آپ بمبئی کے جغرافیے سے واقف نہ ہوں تو میں آپ کو بتا دوں۔۔۔ پیر سین ڈیری ایک ریستوران ہے جو بمبئی کی میک موہن لائن پہ واقع ہے۔ یعنی شہر کی سرحد وہاں ختم ہو جاتی ہے اور سمندر شروع ہوتا ہے۔ ڈیری کا لفظ تھوڑا مغالطے میں ڈالتا ہے، کیونکہ وہاں گائے بھینس نہیں ہوتیں، صرف کچھ موٹی عورتیں ہوتی ہیں، جن کے اسکرٹ اور ساریاں سمندر سے آنے والی تیز ہوا، اُڑاتی رہتی ہے اور جنھیں سنبھالے ہوئے ان کا معنوی حُسن اور بڑھ جاتا ہے اور عشق کے مارکوپولو موہوم امیدیں لیے سامنے بیٹھ کر سیوسیو پیا کرتے ہیں، جو سیب کے رس سے بنتا ہے اور جس کے لیبل پہ صاف لکھا ہے۔۔۔ اس میں شراب نہیں ہے۔۔۔! کولا سے گھبرا کر لوگ سیوسیو پیتے ہیں اور سیوسیو سے وحشت ہوتی ہے، تو کولا پہ لوٹ آتے ہیں، جیسے پڑھے لکھے لوگ پالیٹکس سے گھبرا جاتے ہیں تو سیکس پہ چلے آتے ہیں اور

جب سیکس سے وحشت ہونے لگتی ہے تو پھر پالیٹکس پہ لوٹ آتے ہیں اور جب دونوں بے کار ہو جائیں، تو جیوک باکس میں ایک چوَنی ڈال کر اپنے مطلب کا ریکارڈ سننے لگتے ہیں۔

اپنا اپنا پیار کا سپنا

۔۔۔آخر باہر چل دیتے ہیں۔۔۔

کلیان کے پاس ایک پھٹیچر سی گاڑی تھی، جس کی بیٹری ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی طرح بات بات پہ ناراض ہو جاتی تھی اور بعض وقت تو کوئی بات بھی نہ ہوتی تھی اور یہ ڈاؤن۔۔۔! ایک عجیب طرح کی کلائی میکٹرک دور آیا تھا۔ اُس پہ حیض ویض سب ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ بے حد چڑچڑی ہو رہی تھی۔ سب کے سامنے اسے سڑک پہ دھکیلتے ہوئے ہم عجیب سے لگتے تھے۔ اس وقت وہ سب کمینے جنہوں نے ہماری طرف دیکھ کر کبھی سر بھی نہ ہلایا تھا، فوراً پہچان جاتے اور آواز دیتے۔۔۔ "ہیلو شرما جی۔۔۔" اور میں جواب میں ان سے وہی سلوک کرتا جو پھٹیچر گاڑی سے پہلے وہ مجھ سے کرتے۔ ایسی خالی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا کہ انہیں واقعی میں کوئی اور دکھائی دینے لگتا۔ اور وہ اس قدر گھبرا جاتے کہ

پھر مجھے بھی وہ کوئی اور دکھائی دینے لگتے۔

ہم ابھی دادر ونسٹ روڈ پر سے گزر رہے تھے، جب کہ مجھے یاد آیا پروڈیوسر ڈھولکیا نے سویرے ایک لڑکے کی معرفت مجھے بُلوا بھیجا تھا۔ امید ایکا ایکی، ہائیڈروجن بم کے ککرموتے کی طرح میرے حواس پہ چھا گئی۔ جذبات اور خیالات کا ایک دوسرے پہ سلسلہ وار عمل اور ردّ عمل ہونے لگا۔ جبھی میں نے زور سے آواز دی ”روکو کلیانی، گاڑی روکو۔“

کلیانی نے حیران ہو کر میری ہنکار کو سُنا۔

رشی ہانپتے ہوئے بولا۔ ”تو سمجھتا ہے پہلے چل رہی ہے؟“

داس نے سر ہلا دیا۔ وہ دم لینے کا کوئی بھی بہانہ چاہتا تھا، اس لیے پرے چل کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ مُردے کی طرح مطمئن نظر آرہا تھا۔

میں نے اپنے لہجے میں اور منّت پیدا کی۔۔۔ ”یار میں بھول ہی گیا۔۔۔ ڈھولکیا نے بُلوایا ہے۔۔۔ شاید۔“

”وہ سب ہنڈل مارتا ہے۔“ کلیان نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔۔۔ ”ہم اس کی

پکچر کا فوٹو گرافی کیا۔۔۔ایک دم انگلش۔۔۔! پھر کیا ہوا؟"

میں نے کلیان کو تسلّی دیتے ہوئے کہا"سالا اس کا اپنا فوکس خراب ہے۔"

ڈھولکیا ایک آنکھ سے کانا تھا۔

آپ تو جانتے ہیں۔ بے کار لوگ جتنی جلدی ناراض ہوتے ہیں، اس سے جلدی خوش بھی ہو جاتے ہیں۔ ہنستے ہوئے اس نے گاڑی کا وہیل دادر روڈ کی طرف گھما دیا۔ کچھ دیر میں ہم اسٹوڈیو کے سامنے تھے۔ کلیان نے باقیوں کو روک لیا اور مجھے اندر جانے کے لیے کہا۔ خود بونٹ اٹھا کر وہ گاڑی میں یوں دھنس گیا کہ باہر صرف دو ٹانگیں دکھائی دینے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بچّہ اُلٹا پیدا ہو رہا ہے۔

میں چاہتا بھی نہ تھا، جیگوار، رشی، داس اور کلیان میں سے کوئی میرے ساتھ اسٹوڈیو میں چلے۔ بعض وقت کسی کی ایسی بات بھی ماننا پڑ جاتی ہے جو آدمی ہر کسی کے سامنے نہیں مان سکتا۔ ادھر جب ہر کسی کی پکچر بیٹھ رہی تھی، ڈھولکیا صاحب کی چل نکلی، اور اس نے جوبلی منائی۔ اب اسے قابل لوگوں کی ضرورت تھی۔ میں قابل نہ سہی لیکن اوسط درجہ کا آرٹسٹ ضرور تھا۔۔۔ نہیں نہیں، مجھے

میرے اسی انکسار نے مارا ہے، جو اس شوبزنس میں نہیں چلتا۔ خود اپنا ڈھول پیٹنا پڑتا ہے۔ آخر میرے مقابلے کا کریکٹر ایکٹر اور تھا کون؟ جرنلسٹ پاگل تو نہیں تھے جنہوں نے تصویر "مہاملن" میں ایوارڈ مجھے دِلوایا تھا۔ غالباً اسی بات سے مرعوب ہو کر ڈھولکیا نے مجھے بُلوایا تھا۔ چونکہ وہ خود ڈھولکیا تھے، اس لیے ہر بات میں اپنا ڈھول پیٹنے کے ساتھ بیچ میں کہیں میرا بھی پیٹ ڈالا ہوگا۔

اسٹوڈیو میں پہنچا تو ڈھولکیا صاحب سامنے بیٹھے ہوئے مل گئے۔ وہ اس وقت ایک ایکسٹرا لڑکی کا اس کے سپلائر کے ساتھ جھگڑا چکا رہے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر لڑکی ایک طرف ہٹ کے کھڑی ہو گئی۔ ڈھولکیا صاحب ایسے ہی چوکنّے ہو گئے۔ ایک خواہ مخواہ کا تناؤ پیدا ہو گیا۔ ایک تیز سی نظر سے سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی پنچ شیل پہ دستخط ہو گئے اور کومل وہاں سے سٹک گئی۔

ڈھولکیا صاحب مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ اور میں ان کی باتوں کے بین السطور، اپنا مطلب ڈھونڈنے لگا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ بین السطور تو سب دکھائی دینے لگا، سطور گم ہو گئیں۔ آخر پتا چلا ڈھولکیا صاحب نے مجھے کلّو کی وادی کے بارے

میں معلومات فراہم کرنے کے لیے بُلوایا ہے، جہاں وہ آؤٹ ڈور کے لیے جارہے تھے۔

"کلّو کی وادی بہت خوب صورت ہے۔" میں نے کہا۔ "کلّو میں ناشپاتیاں ہوتی ہیں اور سیب ہوتے ہیں۔"

"اور کیا ہوتا ہے؟" ڈھولکیا صاحب نے پوچھا۔

"اور۔۔۔؟" میں نے کچھ سوتے ہوئے کہا۔ "کلّو میں سیب اور ناشپاتیاں ہوتی ہیں۔"

۔۔۔ میں دراصل بھول گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ کلّو گئے مجھے پندرہ بیس برس ہو گئے تھے، بلکہ اس لیے کہ اس وقت دماغ پہ زور دینے کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ مجھے ڈھولکیا صاحب سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ روئے زمین کے کسی آدمی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس پہ بھی میں کہہ رہا تھا اور "کلو میں پتھریلی زمین ہوتی ہے، جس میں کہیں سے ہریالی پھوٹ نکلتی ہے۔"

ڈھولکیا کو میری ہریالی سے دلچسپی نہ تھی۔

میں نے انہیں بتایا ”وہاں لگڑی۔۔۔ چاولوں کی شراب ہوتی ہے، جسے پی کر مرد اور عورتیں باہر۔۔۔ بازار میں نکل آتے ہیں۔“

”پھر؟۔۔۔ پھر کیا ہوتا ہے؟“

”پھر مرد۔۔۔ عورت کے گلے میں بانہہ ڈال کر جھومنے لگتا ہے۔ ساتھ اس کے گلے میں پڑے ہوئے چنبیلی کے ہار جھومنے لگتے ہیں۔ اور وہ بڑے عاشقانہ انداز سے اس کی نشیلی آنکھوں میں اپنی نشیلی آنکھیں ڈالتا ہوا کہتا ہے۔۔۔ تو میری جوئی۔۔۔ مطلب، بیوی۔“

”مطلب۔۔۔ کسی عورت کے گلے میں بانہہ ڈال کر؟“

”اجی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اپنی بیوی کے۔۔۔“

”او۔۔۔“ اور ڈھولکیا صاحب کچھ مایوس سے نظر آنے لگے۔ عام فلمی کہانی نے ان کے مذاق کو چوپٹ کر دیا تھا اور وہ ناتمام غیر منتج زندگی کے عادی نہ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”کلّو کی لڑکیاں بے حد خوب صورت ہوتی ہیں۔ ڈھولکیا صاحب۔۔۔ ایک سگریٹ ایک سیٹی ان کے لیے بہت ہوتے ہیں۔“ اور پھر

سوچتے ہوئے بولا۔ ”یہ جب کی بات ہے، اب تو شاید پورے کارٹن کی ضرورت پڑے یا دس کے نوٹ۔۔۔“

ڈھولکیا صاحب نے سر ہلا دیا۔ میں سمجھ گیا، فلم میں یا لو لاکھ روپیہ بھی کچھ نہیں ہوتا اور یا پھر ایک کھوٹا پیسا بھی بہت بڑی دولت ہوتا ہے۔ ڈھولکیا چونکہ تین تصویریں بنا رہے تھے، اس لیے خرچ، ان کی بچت ہو گیا تھا۔ بولے ”ہم کلّو میں دسہرے کا سین لیں گے۔۔۔ وہاں کی سولڑکیوں کے ساتھ۔۔۔ لوکل ٹیلنٹ!“ اور پھر انہوں نے وہ آنکھ ماری جو پہلے ہی مری ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر میں، میں اسٹوڈیو کے کمپاؤنڈ میں آ چکا تھا۔ اُوپر دیکھا تو سر پہ آسمان ہی نہ تھا۔ کمپاؤنڈ میں ایک فوّارہ تھا جس میں کبھی پانی نہ آیا تھا اور اس کے کارن اِرد گِرد کی باڑ خشک ہو چکی تھی اور ہریالی کے بغیر اسٹوڈیو کا پورا منظر ایک کھنڈر ہو چکا تھا۔ کچھ دُور جا کر میرے پیر جیسے اپنے آپ رُک گئے اور میں لوٹ آیا۔ ڈھولکیا صاحب کے پاس پہنچتے ہوئے میں نے کہا۔۔۔ ”وہ۔۔۔ آزادی سے پہلے کی بات تھی ڈھولکیا صاحب! کہیں کوئی کام دلوائیے۔ کوئی چار چھ سین کا رول۔“

”میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ ڈھولکیا بولے۔ ”بیسیوں بار تمہیں بتا چکا ہوں۔“

”کچھ تو بچا ہو گا۔ میں نے یوں ہی اُمّید کا دھوکا پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”کچھ میرے حصّے، میری تقدیر کا۔ آپ تو اَن داتا ہیں۔ رائٹر سے کہہ کے ایک آدھ رول بڑھوا دیجیے۔“

ڈھولکیا صاحب نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کوئی بہت بُری چیز کی طرف دیکھتا ہے اور سر ہلا دیا۔ اب وہ مجھے دھندلے دھندلے سے نظر آرہے تھے۔ جب بھی میں بولتا گیا۔ ”ہمارا کوئی رول نہیں؟۔۔۔ کہیں بھی۔۔۔ ہمارا کوئی رول نہیں؟“

ڈھولکیا صاحب نے ایک غیر یقینی انداز سے میری طرف دیکھا، اور پھر منہ پرے کر لیا۔ ان کا نچلا ہونٹ جو پان کی پیک سے سُرخ اور سیاہ ہو چکا تھا، لٹکا ہوا تھا اور وہ چھوٹے سے تر موورتی نظر آرہے تھے۔ اس وقت تو وہ تیسرا چہرہ تھے، جس پہ قہر کے جذبات ہوتے ہیں۔ ایسے میں شیو، جس کی طرف دیکھتے ہیں وہ فنا و برباد ہو جاتا ہے۔۔۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی قریب نہ تھا۔ چنانچہ میں نے ان کے پیر پکڑ لیے اور بولا۔ ”آپ جو بھی کہیں گے میں کروں گا ڈھولکیا صاحب۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں، میرے بیوی بچّے بھوکوں مر رہے ہیں۔۔۔ میں مر رہا ہوں۔“

اس پہ ڈھولکیا صاحب ہنس دیے۔ ”مر جاؤ۔“ وہ بولے۔ ”دنیا میں سینکڑوں لوگ روز مرتے ہیں، ایک تم مر گئے تو کیا ہو گا۔“

”میں مر گیا تو۔۔۔“ میں نے اپنے آپ کو سوچتے ہوئے پایا۔۔۔ ”کچھ نہیں ہو گا۔“

جب تک کومل واپس آچکی تھی، اور ڈھولکیا صاحب اس کا جھگڑا چکانے کے لیے اندر چلے گئے۔

میں باہر چلا آیا اور سوچنے لگا، ترمورتی کا ایک چہرہ وہ بھی تو ہے جس میں شیو بھگوان، پوری کائنات پہ مسکراتے ہیں۔ جب پودے کھِل اُٹھتے ہیں اور ان کے کاندھوں پہ چھوٹے چھوٹے، یوں ہی ہوائیں دامن میں دونوں جہان کی دولت لیے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی ہیں۔ اور ان کے کاندھوں پہ چھوٹے چھوٹے بادلوں کی مٹکیاں ہوتی ہیں، جن میں صحت کی شراب ہوتی ہے، جسے راستے میں آنے والے ہر چھوٹے بڑے کو پلاتی ہوئی وہ گزرتی جاتی ہیں اور اس وقت۔۔۔ یہ کس کا کہنا ہے، میں مر جاؤں گا تو کیا ہو گا؟۔۔۔ میں بتاتا ہوں کیا ہو گا۔ میری بیوی جو میری وجہ سے کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتی، پناہ کے لیے میرے بھائی

کے پاس چلی جائے گی۔ اس کے گلے میں رسّی ہو گی اور منہ میں گھاس۔۔۔ اور میری چھوٹی بھابی اس سے وہ سلوک کرے گی جو کوئی کھاج ماری کُتّیا سے کرتا ہے۔ میں خود اپنی بیوی سے بد سلوکی کرتا ہوں۔ بہت غصّہ آئے تو کچھ کھینچ مارتا ہوں۔۔۔ میں جانور ہوں، لیکن۔۔۔ میں اسے خود ماروں گا۔ کاٹ ڈالوں گا، مگر کسی دوسرے کو اس کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھانے دوں گا۔۔۔ اور میرے بچّے۔۔۔ ڈالی، چنوں۔۔۔ ان کو بدن سے لگاتا ہوں تو میرا اپنا شریر گدرا جاتا ہے۔۔۔ معلوم ہوتا ہے، وہ گوشت ہی گوشت ہے، ہڈی اس میں نام کو نہیں۔۔۔ وہ مر جائیں گے گوشت بھی نہیں رہے گا، ہڈی بھی نہیں رہے گی۔۔۔ نہیں میں مر جاؤں گا تو یہ سب میری آنکھوں کے سامنے تو نہ ہو گا۔

پندرہ بیس گز کے فاصلے میں آدمی کتنا سوچ سکتا ہے، آپ کو اس کا اندازہ نہیں۔ میں نے سب پُرانے درشن شاستر اور آج کل کے نئے فلسفے سوچ ڈالے تھے۔ میں نے جیل کی دیواریں سوچ ڈالی تھیں، محلوں کے کنگرے سوچ ڈالے تھے۔ کسی نے گنگا میں ایک ڈبکی لگاتے ہوئے پوری زندگی جی ڈالی تھی، تو میں نے بھی اتنے عرصے میں ایک نہیں کئی زندگیاں جی لی تھیں۔ ایسی زندگیاں جن میں

آدمی مرتا نہیں، صرف شکل بدل لیتا ہے۔۔۔ پھر یہ موت سے ڈر کیسا تھا؟ میری بیوی۔۔۔ بچّے۔۔۔ کسی دوسری شکل میں ان کی بھی شکل دوسری ہو گی۔۔۔! نہیں، میں انہیں انہی شکلوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مادّۂ حیات اپنی اَن گنت جمع تفریق میں کتنا ہی اپنے آپ کو دُہرائے، کتنا ہی سر کو کیوں نہ پٹکے، ایسی پیاری شکلیں پھر نہ بنا سکے گا۔ نہ ایسی ہنسی دیکھنے میں آئے گی نہ ایسی خوشی اور نہ ایسا رونا۔۔۔ آخر رونا اور پھر رونے والے کو پچکارنے، دِلاسا دینے میں بھی تو ایک مزا ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ کیا آدمی اتنا ہی کٹھور ہو گیا ہے؟۔۔۔ کہیں کوئی مر جائے، اسے پروا نہیں کیونکہ اس کا حلوہ مانڈا، اس کے بوٹی کباب، شراب اور عورت بنے ہیں۔ میرے دو بچّے ہیں۔ ڈالی بڑی لڑکی ہے تین سال کی اور چنوں سال سوا سال کا ہے۔۔۔ بیٹا۔۔۔ پنگوڑے میں پڑا، اونی سوئٹر میں پھنسا ہوا، وہ بالکل ایک بلّی کا بچّہ معلوم ہوتا ہے۔ میری بیوی اسے ڈالی سے زیادہ پیار کرتی ہے، اس لیے کہ وہ مقابل کی جنس کا ہے۔۔۔ نر جو میری نسل کو آگے چلائے گا۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر میری نسل۔۔۔ ایک بے کار، بے ہودہ آدمی کی نسل۔۔۔ چنوں کو پیار کرتی ہوئی وہ آدھی پاگل ہو جاتی ہے۔ اسے نہلا دُھلا کر لاتی ہے اور ایک نرم سے

تولیے سے اس کا بدن پونچھتی ہے۔ وہ ہنستا روتا، مچلتا ہے اور میری بیوی اسے گدگدی کرتی ہے۔ ایسا کرنے میں اس کے اپنے گدگدی ہونے لگتی ہے۔ میں جو دیکھتا ہوں اس کی بھی گدگدی ہونے لگتی ہے۔ جیسے میری بیوی کی انگلیاں چنوں کے بدن پہ نہیں، میرے بدن پہ ناچ رہی ہیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم کیڈل روڈ پہ جا رہے تھے۔ جو لوگ بمبئ کے جغرافیے سے واقف ہیں، جانتے ہیں دادر سے پیر سین ڈیری جانے کے لیے نکلیں، تو کیڈل روڈ راستے پہ نہیں پڑتی۔ ایسے لوگوں کو میں بتا دوں، اگر کسی مرد کا نام کلیان ہو اور اس کی بیوی کا نام راجی۔۔۔ اور درشن نام کی کوئی لڑکی راستے میں آ پڑے، تو پھر کیڈل روڈ بھی پڑ سکتی ہے۔ درشن کلیان کی 'وہ' تھی، اگرچہ کلیان بے کار تھا، پانچ بچّوں کا باپ تھا۔ اس کی گاڑی کھٹارا تھی، اس پہ بھی درشن کلیان کے لیے۔۔۔ "یہ سب کچھ اور جنت بھی" کا رتبہ رکھتی تھی اور ہم کلیان کو ہمیشہ اس بے راہ روی پہ ڈانٹا کرتے تھے۔ لیکن اس دن مجھے پتا چلا۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔۔۔ اگر وہ سب ٹھیک ہے تو یہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔ کلیان ڈھولکیا کی طرح کا نہ تو ہول سیلر تھا اور نہ کسی کی مصیبت سے فائدہ اٹھانے والا۔۔۔ درشن تو ایسے ہی تھی، جیسے راہ

جاتے کسی کے گھر میں لگے جھاڑ سے رات کی رانی کی خوشبو آ جائے۔۔۔ انسان کہاں تک اپنی ناک بند کر کے چل سکتا ہے۔۔۔؟ وہ یہ سب کرنا چاہتا ہے اور پھر بیٹھ کر رونا، پچھتانا بھی۔۔۔ اگر وہ روئے پچھتائے نہیں، تو ہمارے مندر، ہماری مسجدیں اور گرجے کہاں جائیں؟ کہاں جائیں اسکولوں کے ماسٹر اور قوموں کے رہنما؟۔۔۔ بڑی بڑی نصیحتیں، لمبے چوڑے بھاشن اور گنجلک فلسفے۔۔۔؟ لیکن ہم ابھی درشن کے فلیٹ پہ پہنچے ہی کہاں تھے۔ سامنے کسی حادثے کی وجہ سے ٹریفک رُک گئی تھی۔۔۔

جہاں سے ٹریفک رُکنا شروع ہوئی تھی۔ وہاں کچھ دو منزلہ بسیں کھڑی تھیں۔ آخری بس کے پیچھے کچھ کاریں، وین اور ٹھیلے وغیرہ تھے جن میں سے لوگ لپک لپک کر موقع واردات پہ پہنچ رہے تھے۔ کچھ لوگ گاڑیوں میں بیٹھے پاں پاں ٹاں ٹاں کر رہے تھے اور کچھ لوگ اِدھر اُدھر ہو کر نکل جانا چاہتے تھے، لیکن ایک گتھی ہوئی لائن میں پھنس چکے تھے۔ اگر کوئی نکلتا بھی تو مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑیاں اسے جگہ نہ دیتیں۔

کیا ہوا؟ کون ماں کا لال تھا، جو آج بیچ سڑک کے پڑا تھا؟ آج کس کی پیاری کا انتظار

صدیوں پہ پھیل گیا تھا؟۔۔۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

ہم تینوں چاروں، گاڑی سے نکل کر لپکے۔ ڈھولکیا کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ایک تم مر گئے تو کیا ہو گا؟۔۔۔ کیا واقعی، کچھ نہ ہو گا؟ یہ جو چل بسا ہے اس کے مرنے پہ بھی کچھ نہ ہو گا؟ شاید انسان اتنا ہی سنگ دل ہو گیا ہے۔۔۔ جب ہی اس نے ایک دوسرے کو تہس نہس کرنے کے لیے اس قدر خوفناک ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں۔ ایسی سنگ دِلی اور بے رحمی کے بغیر جن کا استعمال ہی ممکن نہ تھا۔۔۔ کیا اس بدقسمت کے لیے کوئی نہیں مرے گا؟۔۔۔ کوئی اپنا خون نہیں بہائے گا؟۔۔۔ انسان کے لیے کوئی امید نہیں۔۔۔

جب تک ہم موقع پہ پہنچ چکے تھے۔۔۔ لوگ ہنس رہے تھے۔۔۔ یہ کیسے لوگ تھے؟

پھر کچھ اور قہقہے پڑے اور کسی کے پیچھے کی طرف بھاگنے کی آواز آئی۔ جیگوار ہم سب سے لمبا تھا۔ بھیڑ کے پیچھے کھڑے ہو کر اُس نے ایڑیاں اُٹھائیں اور سڑک پہ دیکھا۔ اُف! صورت کیسی مسخ ہو چکی ہو گی، بس کے ساتھ ٹکرانے سے چیتھڑے اُڑ چکے ہوں گے اور خون۔۔۔ جبھی جیگوار لوٹا تو وہ بھی ہنس رہا تھا۔ میں بھاگ کر

بس کی لینڈنگ پہ جا کھڑا ہو، جہاں سے میں نے دیکھا۔۔۔

وہ نظارہ میں زندگی بھر نہ بھولوں گا، جس کے دیکھنے کے بعد لوگوں کی زبان پہ قہقہے تھے اور میرے گلے میں آنسو، جن کے بھنور میں ڈھولکیا اور اس کی قماش کے سب لوگ ڈوب گئے تھے اور جن سے انسان کی معصیت دھُل گئی تھی۔۔۔ ایک بِلّی کا بچّہ بائیں حصّہ پہ تقریباً سڑک کے بیچ بیٹھا ہوا تھا اور بس کے ڈرائیور کنڈکٹر اور دوسرے لوگ اسے ہٹانے، بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن وہ اپنی جگہ پہ گل محمد ہو رہا تھا!

وہ بے حد خوب صورت تھا۔۔۔ بِلّی کا بچّہ!۔۔۔ مشکل سے دو مہینے کا ہو گا۔ اس کا رنگ سفید تھا، جس پہ کہیں کہیں شربتی سے چھینٹے دکھائی دیتے تھے۔ آنکھوں پہ دو گہرے نارنجی سے داغ تھے جن میں سے اس کی پیلی، چمکتی ہوئی آنکھیں اور بھی پیلی چمکیلی دکھائی دے رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کوئی عورت کچھ بُنتی ہوئی ادھر سے نکلی ہے اور اُس کے پرس یا ٹوکری میں سے اُون کا گولا سڑک پہ گر گیا ہے۔۔۔

ایک طرف اوٹو ایکسپریس تھی، قریباً بارہ فٹ اونچی اور دوسری طرف وہ تھا، بلّی کا

بچّہ! جو اپنے بے بضاعت وجود کے باعث مقابلے میں اور بھی بے بضاعت ہو گیا تھا۔ کنڈکٹر اسے بچانے، سڑک پر سے ہٹانے کے لیے بڑھا تو وہ اسی پہ جھپٹ پڑا۔ اس بظاہر بے ضرر، اُون کے گولے میں نہ جانے کہاں سے تیز نوکیلے پنجے نکل آئے ہیں، جنہوں نے کنڈکٹر کے ہاتھ پہ خراشیں پیدا کر دیں اور ان میں سے خون کے باریک سے قطرے اُمڈنے لگے۔ اس پہ بھی کنڈکٹر خفا نہیں، اُلٹا ہنس رہا تھا۔

"ہے نا سالا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اسی کی جان بچانے کے لیے یہ سب کر رہے ہیں، اور یہی نہیں جانتا۔"

"کتنا ناشکرا ہے" ایک عورت نے کہا۔

اور وہ بدستور کھڑا ابھی تک کنڈکٹر کو گھور رہا تھا اور غُرّانے کی نقل اُتار رہا تھا۔ جیسے کوئی چیلنج دے رہا ہو۔۔۔ "بیٹا پھر تو آؤ!" اور جب کنڈکٹر نے ہمّت نہ کی، تو وہ پھر تھوڑا پیچھے ہٹ کر وہیں بیٹھ گیا، اور گلاب کی پتّی سی زبان نکال کر اپنی پیٹھ چاٹنے لگا۔

ڈرائیور نے کچھ بیزاری کے لہجے میں کنڈکٹر سے کہا۔ ”کتنے لیٹ ہو گئے یار۔۔۔“ گویا اس خوبصورت حادثے میں بے چارے کنڈکٹر کا قصور تھا۔

بس کے بازو میں ایک ٹھیلے والا تھا، جس کے ٹھیلے پہ تیزاب کی بڑی بڑی بوتلیں پڑی تھیں۔ گویا ایک طرح کا بارود تھا، جو ذرا سی ٹھوکر لگنے پر پھٹ سکتا ہے۔ وہ اپنی گھبراہٹ میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ بلّی کے بچے کے پاس پہنچتے ہوئے ٹھیلے والے نے دو ہاتھ اس کی طرف جوڑ دیے اور بولا۔

”اب اُٹھ جا میرے باپ۔۔۔ بہت ہو گئی۔“

اسے آگے بڑھتے دیکھ کر بلّی کا بچّہ پھر تننے لگا۔ بھیّا ذرا ڈر کر پیچھے ہٹا، تو بلّی کے بچّے نے ایک نہایت ہی لطیف مترنّم سی آواز نکالی۔۔۔

”میں آؤں۔“

اس پہ سب ہنس پڑے اور بس کا ڈرائیور بولا۔ ”ہاں حضور۔۔۔ آپ آیئے۔“

جب تک کچھ اور ٹریفک پیچھے رُک گئی تھی اور ڈرائیور لوگ ہارن بجا رہے تھے۔

ایک مرسیڈیز سے کوئی خوب رو نوجوان نکلا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا منظر پہ

چلا آیا۔ پہلے تو وہ بلّی کے بچّے کی طرف دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر اس نے سب کو پیچھے دھکیل کر ایک ٹھڈے سے قصّہ ہی پاک کر دینا چاہا۔ جبھی لوگ لپکے۔ "ہے ہے، ہے ہے" کی آواز بلند ہوئی اور وہ خوش پوش نوجوان اپنے جامہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔۔۔ "کیا بکواس ہے وہ بولا، گیارہ بجے میرا جہاز اُڑ جاتا ہے۔"

لوگ اس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے، جیسے اس کی روح بھی اُڑ جائے تو پروا نہیں۔ نوجوان نے غصّے سے ہاتھ اپنی پتلون میں ٹھونس لیے اور پسپا ہو گیا۔ پھر اپنی اعصاب زدگی میں آ گے۔۔۔ اور مجبور و مقہور لوٹ گیا، بکتا جھکتا ہوا۔۔۔ "یہ اسی ملک میں ہو سکتا ہے۔۔۔ ایک بلّی کا بچّہ اتنے بڑے شہر کی ٹریفک روک سکتا ہے۔"

ایک نے مسخری کی۔۔۔ "پولیس کو بُلوائیے صاحب۔"

نوجوان نے زور سے پیر زمین پر مارا اور بولا۔ "میں ابھی ٹیلی فون کرتا ہوں۔۔۔ فائر بریگیڈ والوں کو۔"

اور سب ایک آواز میں ہنس دیے۔ جب ہی مجمع میں سے آوازیں آئیں "گیا

گیا۔"

کسی کو خیال بھی نہ تھا، اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ اتنے بڑے مسئلے کا حل یوں ایک پل میں ہو جائے گا۔ بلّی کا بچّہ جیسے اپنے آپ کسی اندرونی ترغیب سے اُٹھا۔ بیچ میں سے کمر اوپر اُٹھائی، دُم تانی جس کے سرے پہ شربتی رنگ کا ایک بڑا سا گپھا تھا۔ پھر اگلے پنجے آگے رکھے، پچھلے پیچھے، اکڑا، گلابی سا منہ کھول کر جمائی لی۔ ارد گرد کے پورے منظر کو کچھ تعلّق اور کچھ بے تعلّقی سے دیکھا اور ایک نہایت ہی سُست رفتار میں سڑک کے دائیں طرف چل دیا۔

"گیانرسی بھگوان۔۔۔"بس کے ڈرائیور نے کہا۔

"گیا۔۔۔ گیا۔۔۔" سب نے تالی بجائی اور ہنستے، کلکاریاں مارتے ہوئے اپنی اپنی گاڑی کی طرف لپکے۔ گاڑی کو راستے سے ہٹانے، ہَوا ہو جانے کے لیے۔ لیکن وہ۔۔۔ بلّی کا بچّہ، بڑی تمکنت سے چلتا ہوا، اب دائیں طرف تقریباً سڑک کے بیچ پھر دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ اب مخالف سمت کی ٹریفک رُکنا شروع ہوئی۔ بائیں طرف سے نکل جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

کوئی اس فضول سی زندگی کو روندتا ہوا نکلنا بھی چاہتا، تو لوگ اسے روک دیتے اور وہ اپنے سامنے بے شمار زندگیوں کی ایک چٹّان سی کھڑی پاتا، جن کے ہونٹوں پہ کف بھی ہوتا اور ہنسی بھی۔ پھر وہی منظر دُہرایا جانے لگا۔

عجیب نادر شاہی تھی۔۔۔ بلّی کے بچّے کی، اور عجیب تختِ طاؤس تھا اس کا۔

بیٹھنا ہی تھا تو کہیں اور بیٹھتا۔۔۔ اتنی جگہ تھی اس کے لیے۔

شاید بلّی کے بچّے کا مطلب تھا، دھرتی کے اس حصّے پہ تمہارا حق ہے، تو میرا بھی ہے۔۔۔

۔۔۔ میں اس پہ کھیلوں گا اور وہ کھیلنے لگا۔ وہ تھوڑی سی جست بھرتا، اور کچھ خیالی چوہے پکڑ کر پھر وہیں آبیٹھتا، اور سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔۔۔ تم تو دن رات اس پہ چلتے ہو۔ آج میں آبیٹھا ہوں تو آفت آگئی۔

تم تو بڑی بڑی مشینوں کے ساتھ دندناتے پھرتے ہو۔ میں چلتا ہوں تو آواز بھی نہیں ہوتی۔ شور روکنے کے لیے پیروں میں گدّے باندھ رکھے ہیں اور یہ ناخن تو صرف بچاؤ کے لیے ہیں۔ ایک رول تمہارا ہے، ایک میرا!

معاملہ مذاق کی حد سے بڑھا جا رہا تھا۔ جب ہی بھیڑ کے بیچ سے کسی بچّی کی آواز آئی۔ "میر اسومو۔۔۔" اب جھلاّنے والے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کوئی اتنا امیر ہو گیا ہو، کہ اسے عام آدمی کے خیالات، بلّی کے بچّے کے جذبات کی ذرا بھی پروانہ ہو، اس لیے جیگوار نے لپک کر بلّی کے بچّے کو کمر سے اُٹھا لیا۔ بجلی کی پھرتی کے ساتھ بڑے بڑے ناخن کسی نہ دکھائی دینے والی سے لپکے اور اگلے ہی لمحے جیگوار کی قمیص میں گڑے ہوئے تھے۔ لیکن جیگوار نے آمد و رفت کے لیے سڑک خالی کر دی تھی اور گاڑیاں چلنے لگی تھیں۔

اب جیگوار فٹ پاتھ پہ کھڑا بلّی کے بچّے کے سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس جانور کے پنجے جیسے اپنے آپ اندر چلے گئے۔ خر خر کی آواز سی اس کے پورے بدن میں سنسنانے لگی۔

جب کلیان نے اپنی کھٹارا گاڑی کا اسٹارٹر گھمایا تو بلّی کا بچّہ سامنے اپنی گلاب کی پتّی سی زبان سے پشت کو صاف کر رہا تھا۔ جبھی ایک جھٹکے کے ساتھ بچّے نے سر اٹھایا۔ ایک جست لی اور نیچے آ رہا۔ اسے کوئی بو آ گئی تھی۔۔۔ مُنّی پڑوس کی ایک لڑکی مٹّی کی ٹھلیا میں دودھ لے آئی تھی۔ جس میں مُنہ ڈال کر بلّی کا بچّہ پُسر پُسر

دودھ پی رہا تھا۔

سچ! اگر پورے شہر کا ٹریفک رُک سکتا ہے تو۔۔۔تو۔۔۔

خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس میرے دوست نہیں۔ ان معنوں میں جن میں کہ دوست ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسے ہونا چاہیے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے ہمیشہ انہیں اپنا بزرگ اور پیش رو مانا اور یوں احترام کرتے ہوئے ٹال دیا۔ کچھ اسی قسم کا سلوک انہوں نے بھی میرے ساتھ کیا۔ ادبی سلسلے میں بارہا میری پیٹھ ٹھونکی، تحریری طور پر مجھے تسلیم کیا اور اس کے بعد ٹکسال باہر کر دیا۔ حال ہی کی بات ہے جب کہ میں نے انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تو بلا تکلّف

انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "تم رہتے کہاں ہو؟"

عباس صاحب کی ہمدمی کا شرف بھی مجھے حاصل نہیں ہوا، جس میں میرا قصور ہے تو ان کا بھی۔ میرے خیال میں انہوں نے میری طرح دوستوں کا انتخاب امتیازی نظریہ سے نہیں کیا۔ ایک واضح ارادے سے کسی صحیح آدمی کو تو قریب لانے کی کوشش نہیں کی۔ جی ہاں صحیح آدمی کے سلسلے میں اگر میرا اشارہ خود اپنی طرف ہے تو چند دوسرے لوگوں کی طرف بھی جو نقد و نظر سے عباس صاحب کی بہتری کا سامان کر سکتے تھے اور خود بھی ان سے سیکھ سکتے تھے۔ جو بھی ان کے پاس آیا، انہوں نے آنے دیا۔ یہی نہیں۔ جو ان کے پاس سے گیا اسے جانے بھی دیا۔ پاس آنے والوں میں کچھ تو پہلے ہی پیر مغاں تھے اور اگر نہیں تھے تو عباس صاحب کے حسن سلوک نے ہمیشہ کے لیے انہیں بنا دیا۔۔۔ اور جانے والوں کا تو ذکر ہی کیا؟

اس مؤدب فاصلے کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم مجھے ان کی ہم مشربی کا فخر حاصل ہے جس سے ہمدمی اور دوستی کہیں دور کی بات نہیں۔ پھر تھوڑا جاننے والے میں اتنا انکسار تو ہوتا ہے کہ وہ کسی کو جاننے کا حتمی دعویٰ نہیں کرتا۔

برخلاف اس کے ہمیشہ ساتھ رہنے والا اس سلسلے میں بڑی بونگی باتیں کرتا ہے۔
جن سے پتا چلتا ہے کہ جو آدمی جتنا قریب ہوتا ہے، اتنا ہی دور بھی۔

زندگی میں کم ہی آدمی آپ نے ایسے دیکھے ہوں گے جن کی شکل پیدائش سے لے کر آخر دم تک ایک ہی سی رہی ہو۔ جس کی وجہ سے وہ بہت سے جرائم نہیں کر سکتے۔ میں نے عباس صاحب کو ان کے بچپن میں تو نہیں دیکھا لیکن اپنے فزیالوجی کے محدود علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت بھی عباس صاحب اپنے اس لائبریری اڈیشن کا پیپر بیک ہوں گے۔ اور کچھ نہیں تو پچھلے پچیس برس سے تو میں ان کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ جہاں ذہنی طور پر ان کا قد بڑھا ہے، جسمانی طور پر آپ وہی کے وہی ہیں۔ چہرے پر جس فہم و فراست کے نشان پہلے تھے، وہی اب بھی ہیں۔ ویسے ہی نگاہ اُچٹ کر سامنے والے پہ پڑتی ہے۔ وہی مونچھوں کی ہلکی سی تحریر جس کے نیچے پتلے سے ہونٹ جو خفگی یا کھسیانے لمحوں میں کچھ اس طرح سے ملتے ہیں کہ انہیں پھڑ پھڑانا کہا جا سکتا ہے اور نہ بھینچنا۔ ان کی ہنسی بے ساختہ ہے مگر ریشمی، جسے استعمال کرتے ہوئے وہ ایکا ایکی رُک جاتے ہیں۔ معتبر آدمی کو زیادہ ہنسنا نہیں چاہیے! سر پر کے بال پہلے ڈھائی تھے، اب دو رہ گئے ہیں۔ اس

کے باوجود سکھوں کے خلاف نہیں۔ بلکہ کئی دفعہ میں نے انہیں کسی سکھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پایا ہے۔

لباس میں سادگی ہے اور استغنا کا فن بھی۔ ان کی عام نشست و برخاست کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ زندگی میں تاکید تکلّفات پر نہیں، کچھ اور ضروری باتوں پر ہے، جس میں ادب، صحافت، فلم، سیاست اور دوسری بیسیوں قسم کی سماجی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ دنیا کے موجودہ سیاسی نظام میں اگر انہیں اسرائیل اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان چننے کا حق دیا جائے تو وہ یقیناً عرب جمہوریہ کو چنیں گے۔ صدر جمال عبدالناصر کی پیروی کریں گے لیکن شکل ہمیشہ اسرائیل کے بین گورین سے ملے گی۔

میں نے عباس صاحب کو پہلی بار لاہور میں دیکھا جہاں وہ اپنے صحافی دوست ساٹھے کے ساتھ کوئی فلم بنانے کے سلسلے میں آئے تھے۔ یہ دونوں دوست انڈین پیپلز تھیٹر کی تحریک کا حصّہ تھے، جس کے ایک جلسے میں، مَیں عباس صاحب کو دیکھنے چلا گیا۔ ان دنوں لاہور کے لارنس باغ میں ایک نیا اوپن ائیر تھیٹر قائم ہوا تھا جہاں خوب ہی ہنگامہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کبھی نہیں تو اردھ کمبھی

ضرور ہے۔ چنانچہ عباس صاحب کو دیکھنے کے سلسلے میں مجھے خوب دھکے پڑے۔ خیر، دھکوں کی بات چھوڑیے، وہ تو زندگی کا حصّہ ہیں۔ ہم سب دھکے کھاتے ہیں۔ کبھی مل کر اور کبھی الگ الگ۔ ایک بار پہلے بھی جب لاہور کے بریڈلا ہال میں مہا کوی ٹیگور کو دیکھنے گیا تھا تو اس سے بھی بُرا سلوک ہوا۔ بھگدڑ میں سینکڑوں پیروں کے نیچے دَلا گیا۔ جب بھی میں نے یہی سوچا تھا کہ کیا بڑے آدمی کو دیکھنے کے لیے خود چھوٹا ہونا ضروری ہے؟

اس جلسے میں عباس صاحب ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ باقی کے فضول اور بے کار قسم کے مرد تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور عباس صاحب سب سے ملتے اور سب سے باتیں کرتے پھر رہے تھے، جسے صحافت کی زبان میں کہا جاتا ہے۔ "اور وہ آزادانہ مہمانوں میں گھومتے اور ان سے ملتے جلتے رہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا عباس صاحب کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے۔ ایسا کریں گے تو ان کا اپنا دل ٹوٹ جائے گا۔ اس عمل میں انہیں کتنا ہی بولنا، کتنا ہی وقت ضائع کرنا پڑا۔ وہ اس بات کو بھول ہی گئے اور آج تک بالعموم بھولے ہوئے ہیں کہ جب

تک وہ کسی کا دل نہیں توڑیں گے، بات کیسے بنے گی؟ (دل "بدست آور" کہ حج اکبر است!)

جب عباس صاحب کے چہرے پر ایسی ہی طمانیت برستی تھی، جس سے پتا چلتا تھا کہ بعد میں وہ "آزاد قلم" ہو جائیں گے اور فلموں میں رہے تو "آزاد فلم۔" ایک نقطہ اور بھی کم۔ ان کے چہرے پر سب سے اوپر عقیل اور آزاد روی کے نقوش تھے۔ اس سے نیچے پی سی جوشی کی پارٹی لائن اور سب سے نیچے مہاتما گاندھی کی 'تلاش حق۔' پوری کی پوری، جو چھٹپٹا کر سب سے اوپر چلی آئی تھی۔

اسی دن مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ کسی آدمی کی بڑائی سے بچنے کے لیے اس سے ذاتی طور پر مل لینا ضروری ہے۔ اسے چھُو کر دیکھنا لابدی ہے، چاہے وہ ہاتھ ملانے کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس عمل میں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بھی ہماری ہی طرح کا انسان ہے۔ صرف اس نے زندگی کے خاص شعبے میں حد سے زیادہ محنت اور ریاضت کی ہے اور ہم نے نہیں کی۔ کریں تو ذہنی طور پر بھی ہم ان سے ہاتھ ملا سکتے ہیں۔ ورنہ ہم اپنے ذہن میں ایسے آدمی کو کچھ ایسے مافوق الفطرت انتسابات دے دیتے ہیں کہ وہ خواہ مخواہ ہمیں بامن او تار سو گزا معلوم

ہونے لگتا ہے۔ پھر اسے انسان کی تربیت میں دیکھ کر، عام انسانوں کی سی حرکتیں کرتے پا کر ہمارا طِلسم ٹوٹ جاتا ہے، جس میں اس بے چارے بڑے آدمی کا تو کچھ بگڑتا نہیں، ہمارا اپنا قد پہلے سے بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔

عباس صاحب سے مصافحے کے بعد کم از کم ایک بات کی تسلّی تو ضرور ہوئی کہ جسمانی طور پر ان کا قد مجھ سے بڑا نہیں۔ البتّہ رنگ گورا ہے۔ لیکن کبھی تو افریقی قومیں میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھیں گی اور گوروں کا جوا اتار پھینکیں گی (چنانچہ آج میری پیشین گوئی کتنی پیغمبرانہ ثابت ہو رہی ہے!) رہی ذہنی قد کی بات تو ورزش سے وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

ان دنوں عباس صاحب نے ابابیل نام کی ایک کہانی لکھی تھی جس کا مجھ پر بہت رعب پڑا تھا۔ لائم او فلاہرٹی نے پرندوں کے بارے میں کچھ خوبصورت افسانے لکھے تھے، لیکن عباس صاحب کا افسانہ ''ابابیل'' ان پر بیس تھا۔ جب میں ڈاک خانے میں بابو (بیک نقطہ پیش، یا بو شود!) تھا اور میرے نزدیک کاؤنٹر پر منی آرڈر بک کروانے والے سے لے کر عباس صاحب تک، سب انگریز وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ چنانچہ میں نے لکنت سے پٹی زبان میں افسانے کی

تعریف شروع کی۔ عباس صاحب خوش تو ہوئے لیکن پھر انکسار میں ٹال گئے اور میری کہانیوں کی باتیں کرنے لگے اور میں بھول ہی گیا کہ ابھی مجھے ان کی ایک اور کہانی ''ایک پاؤلی چاول'' کی بھی تعریف کرنا ہے۔ میں خود بھی اپنے افسانوں کی باتیں کرنے لگا۔ میں کس قدر گرا پڑا ہوں گا، کہ انکسار ان دنوں میرے لیے بہت بڑی عشرت کی بات تھی، جیسے عباس کی تعریف میرے نزدیک بہانہ محض تھی۔ اپنی باتیں کرنے کے لیے جب میں عباس صاحب سے مل کر آیا تو مجھے پتا چلا کہ میرے اس وقت جانے بوجھے بغیر انہوں نے اپنی عظمت کا کچھ حصّہ مجھے بھی دے دیا ہے۔ میں گورا نہیں ہوا تو لمبا ضرور ہو گیا ہوں۔

اور یہ عباس صاحب میں امتیازی بات ہے۔ ادیبوں میں (میرے سمیت) کم آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو اپنی باتیں کم کریں گے اور دوسروں کی زیادہ۔ ایک دوسرا شخص جو لوگوں کو بظاہر ''انا'' سے معمور معلوم ہوتا ہے، وہ۔۔۔ اوپندر ناتھ اشک۔ میں جب بھی ان دوستوں سے ملا ہوں، مجھے پتا چلا ہے کہ ادب کے آسمان پر کوئی نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ یہ اسی کا تذکرہ کرتے ہیں، اس کی چیزیں پڑھ کر سناتے ہیں یا پڑھواتے ہیں۔ تھوڑی سی بحث کے بعد مان بھی جاتے

ہیں کہ وہ ستارہ ابھی طلوع ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میں ڈر، محض ڈر کے جذبے سے اس ادیب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ چونکہ ڈر کوئی اثباتی جذبہ نہیں، اس لیے یا تو وہ ادیب مجھے ٹالستائی اور چے خف سے بھی بڑا معلوم ہونے لگتا ہے اور یا پھر اپنے سے بھی چھوٹا۔ میری طرح کے جاگیر دارانہ ذہن رکھنے والے اور بھی بہت سے ادیب ہیں لیکن ایک فرق ہے۔ میں اپنی اس کمزوری کو جانتا ہوں اور اسے دور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن ان میں سے اکثر جانتے ہیں، نہ کوشش کرتے ہیں۔ خیر، وقت بڑے بڑوں کو ٹھیک کر دیتا ہے اور میں اپنے آپ سے مایوس نہیں۔

یہ بات نہیں کہ عباس صاحب اور اشک میں انا نہیں۔ ارے صاحب ہے اور بہت ہے۔ لیکن اسی قدر جس قدر اسے تخلیقی عمل کے لیے ہونا چاہیے اور وہیں جہاں اسے ہونا چاہیے، جیسے اکثر لوگوں کا سیکس تمام تر سر میں ہوتا ہے اور ایک معزّز خاتون کے مطابق۔۔۔ وہاں نہیں جہاں اسے ہونا چاہیے۔ عباس صاحب میں انا اتنی ہی ہے جس میں وہ اپنی ذات کو پہچان سکیں۔ دوسروں سے الگ، اور دوسروں کے بیچ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بہت سے ادیب ساتھی لکھاڑ ہی

بہت ہیں۔

میں نے عباس صاحب کے بہت سے افسانے پڑھے جن میں سے کچھ یاد ہیں اور کچھ بھول گیا۔ بھول جانا شعور کے سلسلے میں رائے ہو تو ہو لیکن انسانی دماغ ایک کمپیوٹر نہیں۔ اس سے بہت بلند ہے جس کی تفصیل یا بحث اس مضمون کا حصّہ نہیں۔۔۔ عباس صاحب کا افسانہ 'بارہ بجے' تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ ایک تو اس لیے کہ اس سے میرا براہ راست تعلق ہے (اگرچہ میں داڑھی کاٹنے اور سگریٹ پینے والا سکھ ہوں) دوسرے اس لیے کہ یہ افسانہ پنجاب کے فسادوں سے متعلق تھا جن میں سے میں بھی گزرا ہوا ہوں اور ریل کی چھت پر ننگے بدن بیٹھ کر تقسیم کے وقت ہندستان پہنچا ہوں۔ اس افسانے میں عباس صاحب نے اپنے ہی طرز کی حسابی مساوات میں برابر کے سکھ اور مسلمان مارے تھے۔ لیکن اس پر بھی سکھوں کی تسلّی نہ ہوئی اور مجھے اپنی قوم سے غدّاری کرتے ہوئے عباس صاحب کے حق میں بیان دینا پڑا۔ آخر میں عباس صاحب کی جان بچ گئی۔ اب، آپ نے بھی عباس صاحب کو پڑھا ہے، ان کی فلمیں دیکھی ہیں۔ آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ میں نے اچھا کیا یا برا؟

جب تک عباس انڈین پیپلز تھیٹر کے دوسرے ساتھیوں سے مل کر ہندوستانی فلم کلاسیک ’’دھرتی کے لال‘‘ بنا چکے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ’’دھرتی کے لال‘‘ پہلی ہندوستانی REALISTIC فلم تھی بلکہ اس نے اپنے ملک کے سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑا اور بیرون ملک کے باشندوں کی توجّہ اس المیے کی طرف دلائی جس کا نام اس زمانے کا ہندستان تھا۔ ’’آج کل‘‘ بھی تکمیل پا چکی تھی۔ اس میں بھی عباس صاحب کے ان افسانوں اور ناولوں کی قسم کا ایک پیغام تھا جو تائید کی کثرت سے پیغام نہیں رہ جاتا، آدمی کو چِڑا دیتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بدصورت نہیں سمجھنا چاہتا۔ ’’انہونی‘‘ پہلی غیر جانب دار فلم تھی جو بہت حد تک کامیاب رہی۔

تقسیم کے بعد میں بمبئی چلا آیا تو اکثر عباس صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہماری ترقی پسند تحریک ان دنوں شباب پر تھی۔ عباس صاحب اس کے راہبر تھے اور راہی بھی۔ کبھی انہیں اس تحریک کی زیادتی معلوم ہوتی تھی اور اکثر کمی۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب کہ غریبوں اور ناداروں کے حق میں ایک مبلّغ کی حد تک شور مچانے والے عباس صاحب کو پارٹی مینڈیٹ کے مطابق تحریک سے عاق کر دینے

کی کوششیں ہونے لگیں۔ تب میں نے پہلی مرتبہ عباس صاحب کو اس قدر غصّے میں دیکھا جب ان کے ہونٹ بھنچ بھی رہے تھے اور پھڑ پھڑا بھی رہے تھے۔ چہرہ لال ہو رہا تھا اور وہ تیز تیز باتیں کیے جا رہے تھے۔ آواز جو پہلے ہی کھسیائی ہوئی تھی اور کھسیا گئی لیکن پانی پت کا ہونے اور اپنے آپ کو پنجابی کہلوانے کے باوجود عباس صاحب کے منہ سے ایک بھی گالی نہ نکلی۔ کیونکہ وہ تہذیب کا تقاضانہ تھا۔

ان دنوں ہم "چور" کارول ادا کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ جس طرف پلڑا بھاری ہو، جھک جائیں۔ کچھ ہمّت اور شخصیت کی کمی اور کچھ دماغی ابطال۔ بس جو اسٹالن نے کہہ دیا وہ آسمانی صحیفہ ہے۔ کبھی کبھی محسوس بھی کرتے تھے کہ یہ سیل (CELL) کیا بلا ہے؟ جس میں بیٹھے ہوئے لوگ عالم کل ہیں، ہمیں سُنے بغیر ہی ہماری قسمت کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں؟ جس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے ورنہ آپ تحریک سے خارج، حالانکہ آپ کی تحریک کا پارٹی سے کوئی تعلّق نہیں، کم از کم براہ راست نہیں۔ اس پہ طرفہ یہ کہ غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں بچ بھی نکلتے ہیں۔ کیونکہ وہ فیصلہ ایک آدمی کا نہیں، کئی پنچوں کا ہوتا ہے اور آپ تو جانتے ہیں پنچ پر میشور ہوتا ہے۔ پھر ہوشیاری کا یہ عالم کہ ان پنچوں میں ایک

ادیب قسم کا آدمی بھی ہوتا ہے۔ ایسا آدمی جو ادب اور فن اور اس کے عوام کے لیے مفید یا غیر مفید ہونے کی سب حدیں جانتا ہے اور پھر اس قدر لوچ بھی ہے کہ برسوں بعد پارٹی لائن کے غلط ہونے پر بھی معافی مانگ سکے۔۔۔

میں تو اپنی نا سمجھی اور کمزوری کی وجہ سے خائف تھا لیکن دوسرے بھی خاموش تھے، جو مجھ سے بھی زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ وہ عباس صاحب کے منہ پر کھری کھری سناتے تھے اور بعد میں اس کا تذکرہ کر کر کے خوش ہوتے تھے۔ اپنی ہمّت پہ خود حیران۔ لیکن عباس صاحب کو ان کی اور اپنی تحقیق کی بہ نسبت اپنے جذبے پر یقین تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسٹالن سے لے کر کیفی اعظمی تک اپنے آپ کو زیادہ قابل سمجھتے تھے، بلکہ اس لیے کہ حقیقت پر پہنچنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی کسوٹی تھی۔۔۔ محبّت۔۔۔ جیسے صحیح آدمی کبھی کبھی خود بھی شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور سرکس کے روپ واکر کی طرح زندگی کے رسّے پر اپنے آپ کو فکر اور جذبات کے درمیان متوازن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہر حال اپنے آخری تجزیے میں وہی کسوٹی نسبتاً ٹھیک اترتی ہے کیونکہ اس کے پیش نظر ادب اور سیاست ریاضی کے گنجلک سوال نہیں رہ جاتے اور نہ انسان

کے سیدھے سادے مسئلوں کی توضیح و تفہیم اسٹالن کے پر جز کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور نہ چاؤ ماؤ کی طرح ہندوستان پر حملے کی۔ تا کہ روس کے کان ہوں۔۔۔ چنانچہ ان سب باتوں کے باوجود عباس صاحب کے قدم اپنے رستے سے نہ ڈگمگائے۔ لیکن، جب تک، بقول شخصے، بہت سا پانی ہمارے دریاؤں میں بہہ گیا تھا۔

ہمارے دوسرے بہت سے دوستوں کی طرح عباس صاحب بھی مقصدی ادب کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی دل اور دماغ کو ہم آہنگ کر کے لایا تو نتیجہ اچھا نکلا ورنہ محض آواز ہو کر رہ گیا، بلکہ شور۔۔۔ عباس صاحب کے کئی افسانے اور دوسری تحریریں ایسی بھی ہیں جو مؤثر نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی ہیں تو کردار کے اعتبار سے سخت خارجی، ہنگامی پہلو لیے ہوئے، جس کے باعث ان کی گونج جلد ہی معدوم ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کے مقصد اور دوسروں کے مقصد میں بھی فرق ہے۔ انہوں نے لڑکی کے سہارے تو ایک طرف، لکڑی کے سہارے بھی انقلاب تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس عمل میں بہت سوں کی طرح منقلب ہوئے ہیں۔ نہ انہوں نے زبان اور جمالیات کو اپنے معنی پہنائے ہیں بلکہ

اپنے مقصد کی جستجو میں کچھ یوں سیدھے گئے ہیں کہ اِدھر اُدھر بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ نظروں سے راستے کی تزئین کرتے جانا عین فن ہے۔

ان کی بہت سی تحریریں پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے عباس صاحب بہت جلدی میں ہیں۔ انہیں ایک کام تھوڑا ہی ہے؟ سیکڑوں ہیں۔ ان کے پاس وقت نہیں اور زمانہ ہے کہ تیز سے تیز تر ہوتا جارہا ہے اور اس کے ساتھ اپنی رفتار قائم رکھنا ایک خالص سائنسی عمل ہے۔ میں اس بات کو فلسفیانہ سطح پر لاتے ہوئے عرض کروں گا کہ وقت کو تھامنا ہی پڑے گا۔ ورنہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ جیسے ہمارے بڑوں نے مٹسون کے ذریعے گویائی تھام لی تھی اور یکسوئی اختیار کر کے کالی بھگوان کی مار سے بھی پرے چلے گئے تھے، اسی طرح کا عمل ہمیں بھی روا رکھنا ہو گا۔ ہم ادیبوں کا کاو اسٹاک اور ہمارا راکٹ یہی ہے کہ جس پر سوار ہو کر مہر و ماہ سے بھی اوپر جا سکتے ہیں۔۔۔ ایک دن آئے گا جب کہ جدلی مادیات کے دعویداروں کو بھی مقصد کی تحلیل اور اس کے اندرونی تضادات کو خاطر میں لانا پڑے گا۔

عباس صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ ان کی بیگم۔۔۔

مرحومہ بھی ایک نہایت ہی پیار کرنے والی عورت تھیں۔ ہم ادیبوں سے وہ بھائیوں کا سا سلوک کرتی تھیں۔ جوہو میں میرا ایک کمرہ ہوا کرتا تھا، جہاں میں بیٹھ کر اپنا کام کیا کرتا۔ عباس صاحب کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ کبھی ان کے ہاں رکتا تو وہ بڑی شکایت کرتیں کہ قریب سے گزر جاتے ہو، آتے تک نہیں۔ ان کی وفات سے ہمیں قلق ہے، تو عباس صاحب کے بارے میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جنسی زندگی کے بارے میں عباس صاحب کا نظریہ ایک عام، نارمل مہذب آدمی کا نظریہ ہے۔ وہ زندگی کے اس حصّے کو بالکل منفرد سمجھتے ہیں۔ انگریزی قول کے مطابق نہ تو وہ کسی کے گندے کپڑے پبلک میں دھوتے ہیں اور نہ اپنے دھونے دیتے ہیں۔ مطلب، اگر ان کے پاس ایسے کپڑے ہیں تو۔۔۔! (ضرور ہوں گے)

ایک چیز جس نے عباس صاحب کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے، وہ ہے ان کے کام کرنے کی حیرت انگیز طاقت و قوّت۔ کہانی لکھ رہے ہیں اور ناول بھی۔ قومی یا بین الاقوامی سطح پر فلم بھی بنا رہے ہیں اور صحافت کو بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ بلٹز کا آخری صفحہ تو بہر حال لکھنا ہی ہے، لیکن ساتھ ہی

خروشچوف کی سوانح بھی ہو گئی۔ پنڈت نہرو سے بھی مل آئے جن سے عباس صاحب کے ذاتی مراسم ہیں۔ پھر پینیتیس لاکھ کمیٹیوں کا ممبر ہونا سماجی ذمہ داری کا ثبوت ہے۔ اور یہ بات ممبر شپ تک ہی محدود نہیں۔ ہر جگہ پہنچیں گے بھی تقریر بھی کریں گے۔

پورے ہندوستان میں مجھے اس قسم کے تین آدمی دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو، دوسرے بمبئی کے ڈاکٹر بالیگا اور تیسرے خواجہ احمد عباس۔ جن کی یہ قوّت اور استعداد ایک عام آدمی کی نہیں۔ چنانچہ جب میں نے ایک بار عباس صاحب کے سامنے اس حیرت کے جذبے کا اظہار کیا تو انہوں نے معمول کے رسمی انکسار سے ٹال دیا اور بولے۔ ”جبھی تو ہر بات میں پتلا پن ہے۔“ اور پھر مُسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”آج کل کیا لکھ رہے ہو؟“

بیچ میں کسی نے ٹوک دیا۔ اس لیے عباس صاحب نے میری آنکھیں نہ دیکھیں جو نمناک ہو گئی تھیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں بیس پچیس برس کا وقفہ آ چکا تھا اور میں اپنے بارے میں کم بات کرنا سیکھ چکا تھا۔

چلتے پھرتے چہرے

اس وقت میں صرف ایک ہی چہرے کی بات کر رہا ہوں جو بہت "چلتا پھرتا ہے۔۔۔" اور وہ چہرہ آج کل کے عام نوجوانوں کا ہے۔۔۔ چنانچہ میرے بیٹے کا بھی۔

اپنے بیٹے کا چہرہ دکھانے کی کوشش میں، اگر کہیں بیچ میں آپ کو میرا چہرہ بھی دکھائی دینے لگے تو بُرا مت مانیے گا۔ کیوں کہ میں آخر اسی کا باپ ہوں، اپنے بیٹے پر ہی گیا ہوں۔ چنانچہ جو کچھ بھی آپ کو میرے بیٹے کے خلاف لکھا ہوا

معلوم ہو گا، وہ دراصل میرے اپنے ہی خلاف ہو گا۔ کیونکہ اسے اس دنیا میں لانے کے علاوہ اس کی جسمانی اور ذہنی تربیت کا ذمّہ دار میں ہوں۔ البتّہ جو اس کے حق میں کہوں گا، وہ میرے بیٹے کی اپنی لیاقت ہو گی، جس میں میرا رتی بھر بھی قصور نہیں۔

میرے بیٹے کا قد لمبا ہے اور رنگ کسی قدر کھِلتا ہوا، حالانکہ میرا قد چھوٹا ہے، اور رنگ بھی پکّا۔ اس کی وجہ غالباً میری بیوی ہے جس کے میکے میں سب لوگ لمبے قد کے ہیں اور رنگ کے گورے۔ میاں بیوی کے ملاپ سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس سے کھٹکا ہی لگا رہتا ہے۔ نہ معلوم کیا چیز نکل آئے؟ مثلاً ایکٹرس ہیلن ٹیری نے جارج برنارڈ شا کو لکھا تھا۔ ''ہم دونوں کا ملاپ ہو جائے تو اولاد کتنی اچھی ہو؟'' جس پر برنارڈ شا نے جواب دیا تھا۔ ''مادام بدقسمتی سے اگر بچّے کو شکل میری مل گئی اور عقل آپ کی تو۔۔۔؟'' شا کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس لیے اگر آپ کو ان کا یہ لطیفہ پٹا ہوا معلوم ہو تو اندازہ کیجیے۔ اگر بچّے کو شکل ہیلن کی اور عقل شا کی مل جاتی تو؟

میرا بیٹا بہت دبلا ہے۔ مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ وہ کسی جیٹ ہوائی جہاز کے بہت

ہی قریب نہ چلا جائے یا کوئی میرے بیٹے کے بہت ہی قریب منہ کر کے پھونک نہ مار دے۔ اس کے مہین سے چہرے پر موٹی سی ناک رکھی ہے جو اس بات کے انتظار میں رہتی ہے کہ چہرے کے باقی خدوخال بھی بھر جائیں تاکہ وہ خود معقول معلوم ہو اور بات بات پر اسے لال نہ ہونا پڑے۔ اس وقت میرے بیٹے کے ناک کے نتھنے یونان سے ہندوستان تک بھاگ کر آئے ہوئے سکندر کے گھوڑے بوس قیلس کے نتھنوں کی طرح کھلتے بند ہوتے ہیں۔ یا اس وقت کام میں آتے ہیں جب انہیں اپنے مالک کی انا یا وہم کو جتانا ہو، ورنہ وہ تو مہینے میں تین چار بار صرف زکام کی وجہ سے بند رہتے ہیں۔

اس کے زکام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جوانی میں مجھے بھی اکثر زکام ہوا کرتا تھا۔ لیکن میں نے ورزش کر کے، وقت پر سو کر اور وقت پر جاگ کر اسے ٹھیک کر لیا تھا۔ لیکن میرا بیٹا اس زکام کو بالکل انقلابی طریقے سے ٹھیک کرتا ہے۔ وہ رات ایک ڈیڑھ بجے تک میکس یا نیویارک کا ہفتہ وار انگریزی رسالہ "ٹائم" پڑھتا رہتا ہے، جس پر اس کا دنیا بھر کے علم کا مدار ہے اور پھر صبح سب سے آخر میں اٹھتا ہے، جب کہ اس کے بہن بھائی اسکول وغیرہ جا چکے ہوتے ہیں۔ ماں گھر کا سب

کام کر چکی ہوتی ہے اور میرا ایک پیر گھر کے اندر ہوتا ہے اور ایک باہر۔ تب وہ نیند کا مارا میرے پاس آتا ہے اور مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ اسے دیکھتے ہی پہلے میں سلام کرتا ہوں۔ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اگر ایک بار میں نے اس کو سلام کے سلسلے میں آنا کانی کر دی تو وہ مجھے کبھی سلام نہیں کرے گا۔ اس کا کچھ نہیں جائے گا۔ میرا سارا دن کڑھتے رہنے کی وجہ سے برباد ہو جائے گا اور آپ جانتے ہیں کہ دنوں کے تسلسل ہی کو زندگی کہتے ہیں۔

میرے بیٹے کے ہونٹ پتلے ہیں اور ٹھوڑی مضبوط جو ایک پکّے ارادے کا ثبوت ہے اور جسے وہ اکثر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر استعمال کرتا ہے۔ آنکھیں چھوٹی ہیں جن سے پاس کا تو سب کچھ دکھائی دیتا ہے اور دور کا اتنا بھی نہیں جتنا کوئی صحت مند آدمی، مٹّی کا ڈھیلا پھینک سکے۔ اس لیے میرا بیٹا آج کل کے نئے علم کا چشمہ پہنتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر کی بھویں گھنی ہیں جو خلوص کی نشانی ہوتی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ میرے بیٹے میں خلوص نہیں۔ اس میں خلوص ہے، بہت ہے لیکن اس کے باوجود وہ کسی آدمی سے دھوکا نہیں کھاتا اور یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آدمی کا دل صاف ہو اور اس میں خلوص ہو، پھر بھی وہ دھوکا

نہ کھائے؟

میرے بیٹے کا ماتھا چھوٹا ہے، کہتے ہیں ایسی تنگ پیشانی کے لوگ زیادہ بھاگیہ وان نہیں ہوتے۔ جس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ راک فیلر کے گھر میں پیدا ہونے کی بجائے ہمارے گھر میں پیدا ہو گیا۔ لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ اس کی ماں کام کر کر کے مری جا رہی ہے، میں مر مر کے کام کرتا جا رہا ہوں اور وہ مزے سے لیٹا ہوا ہے تو مجھے بزرگوں کی کسی بات پر یقین نہیں رہتا۔ وہ فطرتاً بے صبر واقع ہوا ہے۔ اگر وہ کسی کی بات بیچ میں نہ کاٹے تو اپنے چہرے پر رگ وریشوں کی خفیف سی جنبش سے دوسرے کو اس بات کا یقین دلا دیتا ہے کہ آپ کی بات تو میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ اس پر بھی آپ کہتے رہنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے۔ اور یہ اس کی اسی ناطق خاموشی کی وجہ ہے کہ اسے اپنے باپ کو کبھی بیوقوف کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

غالباً یہ اس کی بے صبری نہیں، آج کل کی دنیا تیز رفتار ہے جس سے میرا بیٹا مطابقت رکھتا ہے اور میں نہیں رکھتا۔ وہ کار بھی چلائے گا تو چالیس پچاس میل کی اسپیڈ پر اور میں بیس پچیس پر ٹرک ٹوں رہوں گا۔ اس نے کئی ایک ایکسیڈنٹ

بھی کیے، جن میں سے دو تو بہت قیمتی تھے۔ ایک کوئی اٹھارہ سو روپے کا تھا اور دوسرا کوئی بارہ ساڑھے بارہ سو کا۔ اور اس پر بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے اس بات پر شرمندہ نہ کرے کہ میں اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ایک دن میں اور میرا بیٹا کار میں بیٹھے ہوئے جا رہے تھے۔ میں حسب معمول سلو اسپیڈ میں تھا۔ اچانک پیچھے سے کوئی بچّہ بھاگ کر آیا۔ اسے کار کا دھکا لگا تو فٹ پاتھ پر جا گرا۔ خیر یہ ہوئی کہ اس کی جان بچ گئی اور ساتھ ہی ہماری بھی۔ اسپتال سے اسے مرہم پٹّی کروانے کے بعد ہم گھر کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "دیکھا۔۔۔ میں تمہاری اسپیڈ پر ہوتا تو بچّہ مر گیا ہوتا۔"

"آپ میری اسپیڈ پر ہوتے۔۔۔" میرے بیٹے نے کہا۔ "تو بچے کے آنے سے بہت پہلے نکل گئے ہوتے۔"

یہ شاید خلیل جبران نے کہا ہے کہ آپ اپنے بچّے کو اپنا جسم اور ذہن دے سکتے ہیں، اپنے خیالات نہیں دے سکتے۔ ایک تو یہ کہ لکھنے والوں نے بڑی گڑبڑ کی ہے۔ وہ الفاظ میں حقیقت کا ایک ایک لمحہ جکڑ لیتے ہیں۔ اس وقت آدمی یہ نہیں سوچتا کہ دنیا کی ہر چیز ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی حقیقت مطلق نہیں۔

حقیقت ایک مقامی حیثیت رکھتی ہے اور کاہلی پسند، کند ذہن اس وقت پڑھنا اور سوچنا بند کر دیتا ہے اور اس محدود حقیقت کو دنیا بھر پر پھیلاتا رہتا ہے۔ کوئی خلیل جبران سے پوچھے، "کیوں بھئی۔۔۔ ہم انہیں اپنے خیالات کیوں نہیں دے سکتے؟"

پھر کیوں ہمیں کہا جاتا ہے کہ میاں بیوی کو بچّوں کے سامنے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہیے۔ حالانکہ یہی فطری جھگڑا ہے جسے دیکھ کر بچے کو سمجھنا چاہیے کہ زندگی صرف قلاقند ہی نہیں کونین کی گولی بھی ہے۔ اور اس آدمی کا آپ کیا کریں گے، جس نے کبھی کبھی بچےّ کو ماں باپ کا ننگا بدن دکھانے کی سفارش کی ہے۔ یہ خارجی زندگی ہے جو بچےّ کے خیالات کی رہنمائی کرتی ہے اور آخر اس کی "پریرنا" کا حصّہ ہو جاتی ہے۔ آج کل کے بچےّ کانوں اور آنکھوں کے ذریعے سے ہزاروں آوازوں اور تصورات کو اپنے دل میں اتار لیتے ہیں اور کچھ اس انداز سے کہ نہ آپ جان سکتے ہیں اور نہ میں جان سکتا ہوں۔

آج کا بچّہ اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ اسے کوئی جنم دے گیا تھا یا وہ برسات کے پہلے قطرے کے ساتھ اس دھرتی پہ ٹپکا تھا۔ وہ اپنے بڑوں سے اپنی اور ان کی

پیدائش کے بارے میں سوال پوچھتا ہے اور رسمی جواب حاصل کر کے چُپکے سے قلم اُٹھاتا ہے اور اپنے جوابی مضمون میں لکھتا ہے۔۔۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پورے خاندان میں چار پشت سے کوئی بھی قدرتی طریقے سے پیدا نہیں ہوا۔

دراصل کرشن ویاس سے لے کر وشنو پربھاکر تک سب لکھنے والوں نے گڑبڑ کی ہے۔ وہ اس زمانے سے اتنا ہی پیچھے ہیں، جتنا زمانہ ان سے آگے ہے۔ چلیے وقت کے اعتبار سے ہی سہی، مانیے ہم نے سب کچھ پایا ہی نہیں، کھویا بھی بہت کچھ ہے۔ لیکن اس کھونے میں جو کچھ ہم نے پایا ہے، اسے کالی داس، بھوبھوتی اور شیکسپیئر آج نہ پا سکیں گے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اتنا تاؤ نہ دیجیے کہ میں اِن بڑے لوگوں کو آج کے نقطۂ نظر سے دیکھوں، میں کس قدر بے بضاعت ہوں، ان مہان ہستیوں کے مقابلے میں۔ لیکن آج کے نوجوان کو میرا یہی مشورہ ہے کہ مجھے پڑھیں اور پھینک دیں اور واقعی کسی نامحسوس دلیل کی بنا پر مکمل طور پر رد کر دیں اور میں یہ محسوس کروں۔ میرا بیٹا بھی ٹھیک ہے اور میں بھی غلط ہوں!

میرا بیٹا میری اتھارٹی کو نہیں مانتا، کسی کی اتھارٹی کو بھی نہیں مانتا۔ میں روتا ہوں۔ میرے بڑوں اور پیش رووں کی روحیں کسی آسمان میں کلبلاتی ہیں اور وہ میرے ساتھ مل کر اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی اپنے زمانے میں انقلابی تھے اور انہوں نے اتھارٹی کے خلاف جہاد کیا تھا اور اس کی وجہ سے کڑی مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ کیونکہ ان کے زمانے میں بھی ہماری ہی طرح کے ماں باپ تھے۔ حاکم تھے۔ مذہبی پیشوا تھے۔ انہوں نے بھی وقت کو تھامنے کی کوشش کی تھی اور نئے اخلاق کو دیکھ کر سر پیٹ لیا تھا!

آپ اندازہ تو کیجیے کہ میرے بیٹے کو کن چیزوں سے نبٹنا پڑتا ہے، زندگی کی رفتار سے، قدم قدم پر ایک کڑے مقابلے سے، مادی اور روحانی قدروں کی کشاکش سے، پرانے اور نئے کے جھگڑوں سے۔۔۔ میں نے اگر بہت پڑھا بھی ہے تو میرا ذہن جاگیردارانہ ہے لیکن میرے بیٹے کا نہیں۔ میں ایک خاص قسم کا ادب اور متابعت اس سے مانگتا ہوں جو وہ مجھے نہیں دے سکتا اور دینا بھی نہیں چاہتا۔ میں جب اس کی طرف دیکھتے ہوئے جھلا کر کہتا ہوں۔۔۔ تم آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے، تو میں یہ بھول جاتا ہوں کہ یہی فقرہ مجھے بھی میرے ماں باپ نے

کہا تھا۔ ہمارے بڑوں کے زمانے میں سرطان (کینسر) صرف ایک پھوڑا تھا جس پر کوئی مرہم لگایا جاتا تھا اور مصفّیٰ خون کی بوتل پینی پڑتی تھی۔ ان کے زمانے میں دباؤ اتنے نہ تھے کہ انسانی شخصیت ایک ٹوٹے ہوئے آئینے کی طرح نظر آئے۔۔۔

جب "سکزوفیرنا" کا لفظ ایجاد نہ ہوا تھا۔ خواب آور گولیاں استعمال نہ ہوتی تھیں اور نہ لوگوں کو ایل ایس ڈی چوبیس یا اس کھمب کا پتا تھا جس کا رس پی کر۔۔۔ انسان کو اپنا ہی لطیف جسم گہرائیوں میں اترتا اور بلندیوں پر پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے اور جن بے حد حسین سبزہ زاروں میں وہ جاتا ہے، وہ انسان کے اپنے دماغ اور اس کے شعور کی تہیں ہیں جن میں سیلا کانٹ مچھلی سے لے کر آئن سٹائن تک کے سب مجرّبات چھُپے پڑے ہیں اور جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمارے رشی مُنیوں نے ہزاروں سال تپسّیا کی۔

یہ کہ میں اپنے بیٹے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا، ایک حقیقت ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ یونہی میں نے اپنے آپ کو صفر کرنے کی کوشش کی ہے تو مجھ پر بڑا ظلم ہو گا۔ اگر میں جانتا بھی ہوں کہ سوئز کی نہر فرانسیسی انجنیئر ڈی لیلپس نے بنائی

تھی تو بھی میں اپنے بیٹے کے سوالوں کا جواب کچھ اس انداز سے دوں گا جس سے اس کی تسلّی نہ ہو گی اور میں اس بات کو چھپانے کی کوشش کروں گا۔ میں بھی سب باپوں کی طرح جاہل ہوں اور میرا زمانہ لد گیا ہے۔ میری حیثیت اس وقت اس ''ڈیڈی'' کی طرح ہو گی جس کے بیٹے نے پوچھا، ''ڈیڈی! یہ مصر کے مینار کیوں بنائے گئے ہیں؟''

''خدا معلوم۔ بس بنا دیے، اگلے وقتوں میں بہت زیادہ وقت تھا لوگوں کے پاس!''

''زرافہ کی گردن اتنی لمبی کیوں ہے ڈیڈی؟''

''بھائی کسی جانور کی لمبی ہوتی ہے اور کسی کی چھوٹی۔''

''ڈیڈی! بچّہ صرف عورت ہی کو کیوں پیدا ہوتا ہے؟''

''کیسی باتیں کرتے ہو۔ اگر مرد کا بچّہ پیدا ہونے لگے تو پھر وہ عورت نہ ہو جائے!''

''ڈیڈی! اگر آپ میرے سوالوں سے خفا ہوتے ہیں تو میں نہ پوچھوں۔''

”نہیں نہیں پوچھو بیٹا، سوال نہیں پوچھو گے تو علم کیسے ہو گا؟“

میرا بیٹا رات کو کیا سوچتا رہتا ہے؟ کیوں رات دیر تک اسے نیند نہیں آتی؟ کیا صرف روغن بادام یا خواب آور گولیاں ہی اس کا علاج ہیں؟ کیا اسے سیکس ستاتا ہے؟ کیونکہ اس کی عمر ستائیس سال کی ہو چکی ہے اور اس کے چند مطالبے جائز ہیں۔ پھر اس نے شادی سے کیوں انکار کر دیا۔ کیا صرف اس لیے کہ جب تک وہ اس دنیا کی تگ و دو میں اپنا مقام نہ بنائے گا، کسی لڑکی کی زندگی تباہ نہ کرے گا؟ کیوں ہمارے زمانے میں لوگ اس عقیدے پر شادی کر لیا کرتے تھے کہ عورت لکشمی ہوتی ہے؟ اس کے آنے سے قسمت کے دروازے اپنے آپ کھل جاتے ہیں۔ اکثر وہ نہیں کھلتے تھے، صرف چند تاریک مستقبل والے بچّے اس دنیا میں چلے آتے۔

میرے بیٹے کے خیالات کیا ہیں؟ میں ان تک پہنچنے کی کوشش تو کروں۔ اس کی روح میں اتر کر دیکھوں کہ وہ کیوں اتنا خود غرض ہو گیا ہے؟ کیوں وہ دوسرے کسی کے باپ کے پیر بھی چھوتا ہے لیکن صبح اٹھ کر اپنے باپ کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ کیا صرف اس لیے کہ دوسرے کا باپ امیر کبیر ہے اور اس نے اپنے

بیٹوں کو دولت اور شہرت کے ساتویں آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ حالانکہ میرے بیٹے کے باپ نے چند کالے صفحوں کے علاوہ اسے کچھ نہیں دیا۔ کیا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آج کل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میرا بیٹا بھی راتوں رات لکھ پتی ہو جانا چاہتا ہے اور نہیں جانتا کہ پیسا کمانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایک ردّے پر دوسرا ردّا رکھنا پڑتا ہے؟ جیسے وہ مذہب اور دوسری رسوم و روایات کا قائل نہیں، وہ گرد و پیش کی دنیا کو دیکھ کر اس قسم کی محنت کا بھی قائل نہیں، ایسے نظام کا بھی قائل نہیں جس میں کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں اور کچھ عیش کرتے ہیں اور کھلے بندوں کہتے ہیں۔۔۔ بزنس میں تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں، میرا بیٹا میرا نام استعمال کرتا ہے اور اس میں کوئی شرم نہیں سمجھتا۔ ایک دن مجھے پتا چلا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کی وجہ سے مجبور اور شرم سار ہے۔ میری وجہ سے وہ کسی سے دس روپے بھی نہیں مانگ سکتا۔ میں نے ہنسی کی آڑ میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے کہا۔ ”بیٹا تو پھر تم سو مانگا کرو۔“ اور مجھے پتا چلا کہ وہ میری زندگی میں سے جذباتیت اور مثالیت کو یکسر نکال دینا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس کے باپ کی اتنی حیثیت تو ہو جائے کہ وہ کسی سے لاکھ دو

لاکھ مانگ سکے جس سے وہ ایک فلم بنائے اور اس سے کئی لاکھ کمائے۔

اس قسم کی مادّہ پرستی، خُودغرضی، سگریٹ، شراب، عورت کی وجہ سے باپ اپنے بیٹوں کو اپنی زمین جائیداد سے برطرف کر دیا کرتے تھے۔ لیکن مادی معنوں میں میرے پاس ہے ہی کیا، جس سے بیٹے کو برطرف کر دوں؟ اگر وہ کسی بات سے ناراض ہو کر چلا جائے تو پھر میں ہی اسے ڈھونڈتا پھروں گا اور اگر میں کہیں چلا جاؤں تو وہ مجھے نہیں ڈھونڈے گا۔ اس لیے میں سخت وحشت کے لمحوں میں بھی چپکے سے گھر چلا آتا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں میرا بیٹا کہیں چلا نہ جائے۔ میں اسے برطرف کرنے کی نہیں سوچتا۔ اس بات سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے انسانی اصول کے کلبلاتے ہوئے درخشاں مستقبل سے برطرف نہ کر دے۔

بیوی یا بیماری

جب سے دنیا بنی ہے، بیویاں بیمار ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ میرے حصّہ میں جو بیوی آئی وہ بھی بیمار تھی۔ ہے! بیویاں اپنی بیماری کی سب سے بڑی وجہ اپنے شوہر کو بتاتی ہیں، ورنہ مائیکے میں وہ بھلی چنگی تھیں۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں۔ البتّہ بیچ بیچ میں اس بات پر بھی مچلتی تھیں کہ ذرا بیمار ہو کر دیکھا جائے۔ چنانچہ اسی اُمّید اور خوشی میں ڈھول ڈھماکوں کے ساتھ ریشمی کپڑے پہنے اور جڑاؤ زیوروں سے آراستہ سُسرال کی چوکھٹ پر پیر رکھتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد

بیماری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ نو آموز (شوہر) دولھا، دلھن کے آتے ہی اسے تشنّج میں دیکھ کر سخت گھبراتا ہے اور بھاگا ہوا بھابی یاماں کے پاس پہنچ جاتا ہے، جو اس کے پھوہڑپنے پہ خوب ہنستی ہیں۔ چونکہ اسے کسی دوسرے کا منہ تو ملتا نہیں، اس لیے اپنا سامنہ لے کر لوٹ آتا ہے۔ شادی کے پہلے ہی چند دنوں میں میاں کو پکّا کرنے کے لیے بیوی تندرستی کے دن، یعنی کنوارپنے اور میکے کو یاد کر کے رونے لگتی ہے، جہاں وہ اپنی نیند سوتی اور اپنی ہی نیند جاگتی تھی اور اب یہاں اسے پرائی نیند سونا پڑ رہا ہے اور پرائی ہی نیند جاگنا۔ البتّہ آنسو خالص اس کے اپنے ہوتے ہیں اور وہ کبھی دولھا کے آنسو نہیں روتی۔

پھر وہ دن آجاتے ہیں جب وہ واقعی طبّی نقطۂ نظر سے۔۔۔ clinically بیمار ہوتی ہے۔ میاں ایک کی جگہ دس دوائیں لاتا ہے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا ہے، جو بیوی سے کچھ سوال کرتے ہوئے ضمناً میاں سے بھی کر جاتا ہے اور اسے سخت شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بیوی کی بیماری، ڈاکٹر کو نبض دکھانے یا اسے دوائیں لا کر دینے سے نہیں جاتی۔ وہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک میاں دوا اپنے ہاتھ سے نہیں پلاتا۔ وہ روٹھتی ہے۔ بُرے بُرے منہ بناتی ہے، میاں پیار کا

دھوکا دیتا ہے یا دھوکے میں پیار کر جاتا ہے۔ یہ تھو تھو کرتی ہیں۔ وہ فو فو کرتا ہے۔ آخر آدھی دوا اندر جاتی ہے، آدھی باہر گرتی ہے۔ اور کچھ دیر کے بعد جنابہ بیوی کا ذائقہ ٹھیک ہوتا ہے تو میاں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے ایک ادا سے کہتی ہے۔ ”اے! تمہارے ہاتھ سے تو میں زہر بھی پی لوں۔“ اور میں یہاں اپنے شوہر بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ بیوی کی اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی سفید، کالا، یا ہرے رنگ کا جھوٹ سمجھیں، ورنہ پھانسی ہو جائے گی۔

اگر بیویاں آس پاس نہ ہوں، یا ہوں تو ہمیشہ کی طرح اپنی ہی بات میں کسی دوسرے کی نہ سنیں، تو میں آپ کو بتاؤں۔ بیویاں دراصل بیمار نہیں ہوتیں۔ وہ یونہی تھوڑے سے نوٹس پر بیمار ہو کر دکھا دیتی ہیں۔ اس بات کو جاننے کے لیے کہ ان کی بیماری کے ساتھ ان کا ہوتا سوتا کتنا بیمار دکھائی دیتا ہے۔ کتنے دکھ اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ جو فعل، بیویوں کی لغت میں محبّت کا دوسرا نام ہے۔ اگر میاں کے چہرے پر بیوی کی بیماری کے کوئی آثار دکھائی نہ دیں، تو وہ اسے نہایت کمینہ اور رذیل آدمی سمجھتی ہیں۔ لیکن دل میں خوش ہوتی ہیں اور کہتی ہیں ”مرد ہے!“ اگر وہ کہیں ہمدردی کا اظہار کرے، کروٹ کروٹ ساتھ مرے، تو

یوں دیکھنے میں خوش نظر آئیں گی، لیکن اندر سے کہیں گی ”زنخا ہے موا۔“

میں بڑی بیماری کی بات نہیں کرتا جو کہ بیوی خود ہوتی ہے، ان چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا ذکر کر رہا ہوں جو دراصل کوئی وجود نہیں رکھتیں اور جو مرد کو اُکسانے کے لیے بیوی دن رات پیدا کرتی رہتی ہے۔ خالص بیوی ہو گی تو روز سویرے اُٹھ کر شکایت کرے گی۔ ”آج میرا سر کچھ بھاری بھاری ہے۔“ پھر وہ ناک سکیڑے گی۔ ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ لے گی اور اس کی یہی بات آپ کو پیاری لگے گی۔ آپ خود بھی محسوس کرنے لگیں گے کہ اس کی وجہ آپ خود ہیں۔ آپ بہت بڑی محبّت، جو لفظ اردو میں لکھتے وقت حجّت معلوم ہونے لگتا ہے، کے ساتھ کہیں گے۔ ”او ہو، ایسپرین ہے گھر میں؟“ چنانچہ ایسپرین ہو گی۔ کوڈاپائرین بھی ہو گی۔ مگر وہ کھائیں گی نہیں۔ آپ سوچنے لگیں گے۔ ان کا کچھ نہ کچھ بھاری ہی رہتا ہے۔ سر نہیں تو پیر ہی سہی۔ پھر بیوی کے بدن میں ایک حصّہ ہوتا ہے جسے وہ کمر کہنے پر مصر ہوتی ہے۔ یاد رہے، یہ عورت کے بدن کا وہ حصّہ ہے، جس پر ہمارے شاعروں اور نثر نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور تعلّی کے مضمون میں، اسے نازک پتلا ہونا تو کیا، نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے۔ مگر بیوی کے سلسلے میں وہی کمر

حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ان شعروں کو اور بیوی کی کمر کو ساتھ رکھ کے دیکھا جائے تو وہی چیز اچھا خاصا کمرہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ ہوتا یا ہوتی تو بدن ہی کے ساتھ ہے، مگر آپ کو اسے ٹوٹا ہوا تصوّر کرنا پڑتا ہے۔ بیویاں اتنی سادہ سی حقیقت نہیں جانتیں کہ میاں کو ان کے بدن کے ہر حصّے سے ہمدردی اور پیار ہوتا ہے۔ مگر کمر سے نہیں، کیونکہ مرد کی فطرت اسے معدوم ہی دیکھنا چاہتی ہے۔ بہر حال بیوی کی ٹوٹی ہوئی یا ٹوٹتی ہوئی کمر پہ کوئی لیپ، کوانٹی فلا جسٹین اثر نہیں کرتا اور نہ درد شقیقہ و عصابہ (Neuroglia) دُور کرنے والی گولیاں۔ لیکن چونکہ اب تک آپ بھی خالص میاں ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے اسی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کہتے ہیں۔۔۔ "بنّو! آج تو تم بڑی حسین لگ رہی ہو۔" پھر کہاں کی کمر اور کہاں کا درد؟ حقیقت یہ ہے کہ کمر درد کے لیے اس سے بہتر دوا آج تک سائنس ایجاد نہ کر پائی۔

میں جانتا ہوں کہ کسی بھی معاشرے میں بیوی کی بیماری پر ہنسنا اچھی بات نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ رونے بھی تو نہیں دیتیں۔ جیسے ان کا میاں کوئی جیوتشی ہے۔ رمّال ہے یا کوئی ولی اللہ۔ اور جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ بیوی کی

بیماری کے ایّام میں میاں جنّت اور دوزخ کے بیچ عالمِ برزخ میں کہیں اُلٹا لٹکا ہوتا ہے۔ چہرہ دیکھو تو غم کے گھٹاٹوپ بادل چھائے ہیں۔ دل کو کریدو تو ایک ہنسی ہے جو اس کان سے اس کان تک پھیلتی جارہی ہے اور منہ سے ناف تک زبردست جھٹکے دے رہی ہے۔

یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ کائنات میں مادہ، نر سے زیادہ سخت جان ہوتی ہے اور اس سے زیادہ لمبی عمر کی متوقع۔ یہی وجہ ہے کہ مسکت بیوی نہایت بے فکری کے عالم میں دن کو پچیس تیس مرتبہ تو ضرور کہتی ہے "ہائے میں مرگئی۔" لیکن یہی بات اپنے میاں کو نہیں کہنے دیتی۔ وہ جانتی ہے، اگر اس نے کہا "میں مر گیا۔" تو وہ سچ مچ مرجائے گا! جلدی یا آسانی سے مرجانے کی سزا قدرت نے مرد کو شاید اسی لیے دی ہے کہ اس کا جنسی نظام عورت کے پُرپیچ جنسی سلسلے کی بہ نسبت بہت سیدھا اور سادہ ہے۔ غالباً اسی لیے بیویاں میاں کی مسلسل تندرستی کی حاسد ہو جاتی ہیں، کیونکہ ان مردوں کو تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں۔ حالانکہ اس بے چارے کا قصور ہے تو صرف اتنا کہ پہلے وہ مرد بنا اور دوسرے ان کا شوہر۔ وہ میاں کو دیکھ دیکھ کر یونہی کباب ہوتی رہتی ہیں اور کسی طرح اس کا بھلا نہیں

چاہتیں۔ اسی لیے وہ مرد کے رنڈوا ہو جانے کو، اپنے بیوہ ہو جانے سے اچھا سمجھتی ہیں۔

بیویوں کی بہت سی بیماریوں میں سے کچھ کہنے کے لائق ہوتی ہیں اور کچھ نہ کہنے کے لائق۔ میاں کو اس بات کی سمجھ بہت دیر کے بعد آتی ہے اور اس کی سمجھ کا سلسلہ معمول کی سیدھی سادی آزمائش اور غلطی، بلکہ حماقت سے شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی سادگی میں بیوی سے براہ راست سوال پوچھ بیٹھتا ہے اور پھر اسی وقت ڈانٹ کھا کر سامنے سیڑھیوں پر جا بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی زبان اگر وہ بے حد خفا نہ ہوں تو بالواسطہ ہوتی ہے۔ وہ تشبیہ اور اشارے کی جان ہے۔ مثلاً حال ہی کی بات ہے۔ میرے ایک دوست نے وطن میں اپنی بیوی کو لکھ بھیجا "اب کے مہینے رہ گئے؟" تو بیوی نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف خط کے ایک طرف تین چھوٹے چھوٹے دائرے بنا دیے۔ گویا عورتوں کی زبان میں ابجد کا کوئی دخل نہیں، جسے ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اگر اس ابجد کو جانتی بھی ہوں گی، تو اسے استعمال کرنا اپنی شان کے شایاں نہ سمجھیں گی۔ ان کی زبان اب تک قدیم مصری خطِ تصویر (Hieroglyphics) سے ملتی جلتی ہے، جسے مصر کے

لوگ کب کے چھوڑ چکے مگر ہماری بیویاں اب تک کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں اور وہ ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

ہمارے ہندوستان میں اپنی بیوی کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے جس کی شکل بیوی ہی کی طرح ہوتی ہے۔ مگر خصلت ایک دم الگ۔ اسے ہم دوسرے کی بیوی کہتے ہیں۔ جس کی بیماری اور بھی ٹیڑھی اور نا قابل علاج ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کسی کی بیوی کے بیمار ہونے کی خبر پائیں اور شامتِ اعمال عیادت کے لیے چلے بھی جائیں، تو آپ صاحبِ خانہ سے پوچھتے ہیں۔۔۔ ”کیسی طبیعت ہے۔ گھر میں؟“

”اب تو اچھی ہے، بھگوان کی دیا سے۔“

”کیا تکلیف تھی؟“

اس پر وہ دوسرے کی بیوی کا میاں یا دوسرے میاں کی بیوی، آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں، جیسے آپ کوئی گھنٹہ گھر ہیں اور شہر کے چوک میں نصب ہیں۔ دوسرے کی بیوی ہونٹوں کے بیچ مُسکراتی ہوئی منہ پرے کر لیتی ہے اور اس عمل میں اپنی بیوی سے بھی پیاری لگتی ہے۔ البتّہ میاں نہایت مکروہ صورت بنا کر کہتا

ہے۔۔۔ ”زنانہ تکلیف۔۔۔“ مطلب یہ کہ اس کے بعد بکواس بند کیجیے۔ آپ کی سٹّی گم ہو جاتی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ بیوی کی بیماری، شاید بیوی سے الگ کوئی چیز ہے۔ مگر اس وقت تک آپ اپنے ہوش میں نہیں رہتے اور جلدی سے کسی اچھے ڈاکٹر کا نام تجویز کر کے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دہلیز ہمیشہ کی طرح ایک فٹ اوپر اُٹھ کر آپ کو ٹھوکر لگاتی ہے، مگر آپ اپنے آپ کو اسی قابل سمجھ کر سنبھل جاتے ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہیں تو خیال آتا ہے، مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کا نام لینا چاہیے تھا۔ چنانچہ تصحیح کی غرض سے آپ لوٹتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو ”بکواس بند کر“ کہتے ہوئے کسی اور واقف کار کے ہاں چل دیتے ہیں، جہاں خوش قسمتی سے کوئی میاں بیمار ہے۔

شاذ ہی کوئی بیوی ہو گی جو مہینے میں چند روز بیمار نہ ہوتی ہو۔ اس میں میری بیوی یا آپ کی بیوی کی بات نہیں۔ دنیا جہان کی، جملہ بیوی جات کا قصّہ ہے۔ ان ایّام میں وہ کچھ یوں لیٹی ہوں گی، جیسے انہیں ہیضہ ہو گیا ہو۔ وہ عاشق کی طرح زرد اور معشوق کی طرح دھان پان نظر آ رہی ہیں۔ چڑ چڑی اس قدر کہ بات بات پر میاں کو کاٹنے دوڑتی ہیں۔ حالانکہ اس غریب کا قصور نہیں۔ گری گدھے پر سے

ہیں اور غصّہ کمہار پر اتار رہی ہیں، جو میاں اب تک شکل سے دکھائی دینے لگا ہے۔ اپنے سڑی پن میں بیویاں بھول جاتی ہیں کہ اس بیماری ہی میں ان کی صحت ہے۔ اگر کسی مہینے میں چھوٹی بیماری نہ آئی تو بڑی آئے گی۔ پھر کھٹّی کھٹّی ڈکاریں آئیں گی۔ سر چکرائے گا۔ اُبکائیاں آئیں گی۔ ایک طرف اس بیماری پر غصّہ آئے گا، دوسری طرف پورے بدن میں خوشی کی سنسناہٹ دوڑ جائے گی۔ میاں پوچھے گا، مگر کبھی نہیں بتائیں گی۔ اشارے سے یہی کہیں گی کہ بس سمجھ جاؤ۔ میاں ایک طرف مجرمانہ اور دوسری طرف فاتحانہ انداز سے بیوی کی طرف متوجّہ ہو گا اور تلافیِ مافات کے سلسلے میں بازار سے سیب اور ناشپاتیاں، قلاقند اور امرتیاں لا کر دے گا، جنہیں لے کر بیوی خوش تو ہو گی مگر بیماری سے اپنا ازلی رشتہ قائم رکھنے کے لیے بڑے سلیقے سے ان سب چیزوں کو طاق پر رکھ دے گی، جو لکڑی کا نہیں، نسیان کا بنا ہوتا ہے۔ وہ شربت روح افزا کی جگہ جل جیرے کی فرمائش کرے گی۔ گلاب جامن کی جگہ، گول گپّے اور آم شریفے کی جگہ چولھے کی مٹّی کھائے گی۔ مرد کو جب بری بات کہنا ہوتی ہے تو وہ خاکم بدہن سے شروع کرتا ہے۔ لیکن بیوی ہے کہ اچھی خبر سنانے سے پہلے منہ میں خاک جھونک لے

گی۔ اگر میاں خفا ہو کر کوئی بات کہہ دے تو یہ بیٹھی بیٹھی کھڑی بولی میں صلواتیں سنائے گی۔

بیوی کی ماہانہ بیماری کی نوعیت الگ ہے اور سالانہ کی الگ۔ پہلی قسم کی بیماری میں پھر میاں کے لیے تھوڑی سی تسکین کی گنجائش ہے لیکن دوسری میں یکسر نہیں۔ اسے سال بھر یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ بڑے افسر نے کہیں اس کے کیریکٹر شیٹ پر اُلٹا سلٹا ریمارک لکھ دیا، یا وطن سے باہر اس کا ٹرانسفر کر دیا۔ اب ایک گھر یہاں ہے، دوسرا باہر بنانا پڑے گا۔ مہنگائی کا زمانہ۔ ان دو گھروں کا خرچ کہاں سے لائے گا۔ آخر وہ اپنے افسر کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور کچھ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے اور پھر وہ دن آجاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو زچّہ خانے کے باہر ٹہلتا ہوا پاتا ہے۔ سگریٹ پہ سگریٹ پیتا ہے۔ نہ اُٹھ سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے، اور بیویاں ہیں کہ اپنی جسمانی تکلیف کے سامنے میاں کی روحانی تکلیف کو کوئی بات ہی نہیں سمجھتیں۔۔۔ میاں کے لیے یہی تکلیف کیا کم ہے کہ زچّہ خانے کے باہر وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا گدھا سمجھتا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس ہی اور بھی بہت سے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ اس احساس کا بیوی کے نزدیک کوئی مول

نہیں؟ بیوی جو مزے سے ایک بچّہ پیدا کر رہی ہوتی ہے۔

آخر عزرائیل کی بہن نرس لیبر روم سے تھوتھنی نکالتی ہے اور میاں سے مختصر سا خطاب کرتی ہے۔ "IT'S A BOY" اور میاں اپنی گھبراہٹ میں نرس سے کہتا ہے۔۔۔ "Congratulations" ۔اس سے پہلے کہ میاں، بیوی کی حالت پوچھ سکے، نرس جاچکی ہوتی ہے۔

اب میاں ہمّت کرتا ہوا اندر جاتا ہے اور بیوی کو اس جانکاہی کے بعد آرام سے سوتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کا سارا اندر، اُبل کر باہر آجاتا ہے مگر وہ یہ نہیں جان پاتا کہ اب کیا کرے؟ ہنسے یا روئے؟ وہ ہنس اس لیے نہیں سکتا کہ خدا اور عورت کے درمیان عظیم سازش کا ایک اور شکار چلا آیا۔ اور رو اس لیے نہیں سکتا کہ اس کی اپنی طرح کا ایک اور گدھا پیدا ہو گیا، جو بڑا ہو کر ضرور محبّت میں مبتلا ہو گا اور پھر شادی کر کے زندگی بھر دوائیں ڈھوئے گا۔ چنانچہ اس وقت میاں کو بھی ڈاکٹر پرچی پر کچھ دوائیں لکھ کر دیتا ہے اور میاں بیوی کو کسی چچی یا پھوپی کی تحویل میں دے کر خود بازار سے دوائیں خریدنے نکل جاتا ہے۔ لوٹتا ہے تو بیوی جاگ رہی ہوتی ہے۔ وہ شکوہ شکایت کی نظر سے میاں کی طرف دیکھتی ہے، جیسے کہہ رہی

ہو۔ ”اس دکھ کی دنیا میں کوئی دوا ہے؟“ لیکن میاں اب تک جان چکا ہوتا ہے، اس لیے دواؤں کا بنڈل کھولنے کی بجائے وہ کوئی اور ہی پیکٹ کھولتا ہے، جس میں سے گلابی رنگ کی نہایت خوبصورت ساڑی نکلتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور ڈبیہ جس میں کلائی گھڑی برآمد ہوتی ہے اور میاں آنکھ میں محبّت اور تاسف کے آنسو لیے ایک اُلٹی رکشا بندھن کی شکل میں گھڑی بیوی کی کلائی پر باندھ دیتا ہے اور ساڑی اس کے قدموں پہ نثار کر دیتا ہے اور کہتا ہے۔

”بنّو یہ رشوت ہے، مول نہیں۔“

اور بیوی کے چہرے پہ پھر سے ایک دلکش مُسکراہٹ دوڑ جاتی ہے، جو ارگٹ اور لائی سول وغیرہ کبھی نہیں لا سکتیں۔

یہ ہم شوہر بھائیوں ہی کی ہمّت ہے کہ بیماریوں کے اس پٹارے سے، جسے بیوی کہتے ہیں، محبّت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے منشی پریم چند کا ایک افسانہ یاد آتا ہے، جس میں ایک بیوی اپنے نکمّے، نکھٹّو اور سادہ لوح میاں کا رونا روتی ہے اور آخر اس بات پر حیران ہوتی ہے کہ اس کی سب ایسی باتوں کے باوجود وہ کہیں آدھ گھنٹہ بھی لیٹ ہو جائے تو اس کی ساری کائنات اُلٹ جاتی

ہے۔ بجنسہٖ یہ بات میں اپنی بیوی کے سلسلے میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کے سارے لڑائی جھگڑے فساد اور گوناگوں بیماریوں کے باوجود میں سرِ شام اپنے آپ کو اس کی تحویل میں پاتا ہوں اور پھر میرے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے جو مرزا اسد اللہ خاں کے ساتھ ہوا تھا:

اسدؔ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

مہمان

میں شروع ہی میں مانے لیتا ہوں کہ مجھے مہمانوں سے نفرت ہے، سخت نفرت ہے! اگرچہ میں اتنا پڑھا لکھا نہیں لیکن یہ بات ضرور جانتا ہوں کہ ہماری سبھیتا میں مہمان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ یہ تو مہمان کی اپنی بدکرداریوں اور اس کے نام میں لگی ہوئی فالتو سی 'م' نے گڑبڑ کر دی، ورنہ وہ تھا ہی مہان۔۔۔ آپ ذرا اسے لکھ کر تو دیکھیے۔

اتھتی سنسکار کا ہماری پستکوں میں بڑا مہتو ہے۔ جگہ جگہ اس بات کی پریرنا کی گئی

ہے کہ مہمان کیسا بھی ہو، اسے بھگوان کر کے مانا جائے۔ اس زمانے میں شاید خیالات کی زیادتی تھی یا سوچ بچار کی کمی کہ ان درشن شاستروں کے لکھنے والے گھوم گھام کر پھر شُبد مہان پہ چلے آتے تھے۔ غالباً وہ سب اس لیے کرتے تھے کہ خود ان کے پاس پہننے کو لنگوٹی تھی اور نہ کھانے کو روٹی اور وہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن ان کو کسی کا مہمان ہونا ہی پڑے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ مہمان کا درجہ بھگوان کا ہے تو میں بڑی نمرتا سے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہوں گا کہ مجھے بھگوان سے بھی نفرت ہے!

جس زمانے میں ہمارے شاستر لکھے گئے تھے، اس زمانے میں جگہ کی کیا کمی تھی؟ سوائے وشالتا کے اور تھا ہی کیا؟ نیچے زمین، اوپر آسمان اور بیچ میں مہمان، چاہے درجنوں لٹک جائیں۔ آج کس کے پاس ۱۰ * ۱۰ فٹ سے بڑا کمرہ ہے؟ شامت اعمال اگر مہمان چھ فٹ کا آجائے تو آپ کو ٹانگیں سکیڑ کر انہیں چھاتی سے لگا کر باقی کے چار فٹ میں گزارا کرنا پڑے گا۔ حالانکہ مرنے کے لیے بھی آدمی کو کم سے کم چھ فٹ جگہ چاہیے۔۔۔ جس میں کہ مہمان پڑا ہوتا ہے۔ صبح اٹھیں گے تو آپ کی ٹانگیں چھاتی کے ساتھ ہی لگی رہ جائیں گی اور جب انہیں پھیلانے کی

کوشش کریں گے تو یوں لگے گا جیسے آپ پھر سے پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگلے وقتوں میں ہمارا پورا فلسفہ مہمان کی مدد کرنے پر تلا ہوا تھا۔ جب لوگ جنگل میں جا کر کند مول وغیرہ کھا لیتے تھے اور اسی میں سنتشٹ ہو جاتے تھے لیکن آج کا دُشٹ مہمان چکن روسٹ سے کم بات ہی نہیں کرتا۔ کچھ اس انداز سے چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو والٹی ریستوران میں بیٹھے ہوئے پاتے ہیں۔ آخر دم تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ بِل وہ دینے والے ہیں۔۔۔ یہ مسئلہ آپ کا ہے، مہمان کا نہیں کہ دیش بھر میں کھانے کو نہیں۔ راشننگ کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے۔ بیوی کی شکل دکان پہ کھڑے کھڑے کیوسی ہو گئی ہے۔ پھر پرانے زمانے میں انسان زیادہ تھے اور مہمان کہیں اِکا دُکا ملتا تھا۔ لیکن آج مال تھوسی کے عقیدے کے مطابق، اس بھوکی ننگی دنیا میں مہمان ہی مہمان رہ گئے، انسان کہاں نظر آتا ہے؟

اس زمانے کے مہمانوں میں پھر کوئی آنکھ کی شرم تھی، حیا تھی، دوسرے کی تکلیف کا احساس تھا۔ لیکن آج کل کے مہمان؟ ارے توبہ۔ آپ تو انہیں مجھ سے

بہتر جانتے ہیں، کیونکہ ہندوستان میں کوئی ایسا آدمی نہیں جسے اس موذی سے پالا نہ پڑا ہو۔ وہ موت کی طرح سے ہر ایک پہ آتا ہے۔ جینا جھوٹ ہے اور مرنا بھی جھوٹ۔ صرف مہمان سچ ہے۔ آج کل کے مہمان کو تو بس گولی ماریے۔ ذرا سوچیے تو، ہم جو خود اس دنیا میں کل دو ہی دن کے مہمان ہیں اور اوپر ایک اور مہمان کو لے آئیں جو مہینے بھر سے پہلے جانے کا نام ہی نہ لے؟ نا صاحب۔ گھر میں مہمان لانے سے تو اپنی بیوی پہ سوت لے آنا اچھا۔

اس دنیا میں تکلف کی بھی ایک جگہ ہے۔ مثلاً آپ کسی کے گھر کھانا کھائیں تو شوربے میں ڈوبے ہوئے دو آلوؤں کے بارے میں ضرور کہنا پڑے گا۔۔ واہ صاحب مزا آ گیا۔ برسوں کے بعد ایسا لذیذ کھانا نصیب ہوا ہے۔ یا رخصت ہوتے ہوئے اپنے میزبان کی بیوی کے بارے میں کہنا ہو گا۔۔ آپ کی بیوی بڑی CHARMING ہے۔ سمجھ دار میاں تو اس بات کو سمجھتا ہے۔ وہ صرف ایک بار مُڑ کر اپنی بیوی کو دیکھتا ہے اور پھر گھبرا کر بوٹ کے تسمے بند کرنے لگتا ہے۔ لیکن مہمان؟ آپ کہیں غلطی سے بھی اسے کہہ دیں۔ آپ غریب خانے پر تشریف لے چلیے، وہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے تو پھر دیکھیے کیسے وہ آپ کے ہاں

انتقال فرما جاتے ہیں اور وہیں اپنی قبر بنا کر رہتے ہیں۔ آپ کو، آپ کی بیوی کو، آپ کے بچّوں کو مجاور بنا کر چھوڑتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد آپ کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنے ہی گھر میں مہمان ہو گئے۔ میزبان تو وہ ہیں، بذاتِ خود!

اپنے دل میں پھر سے گھر کا احساس جگانے کے لیے آپ کے پاس ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگلے پھیرے میں آپ اس کے گھر میں مہمان ہو جائیں اور ہر بات میں ان کی جھونپڑی کو بار بار دولت خانہ کہیں۔ ''تشریف رکھیے''، ''پہلے آپ'' اور اس قسم کے جملوں کا آزادانہ استعمال کریں۔ پھر ایک اور بات جو ان سے سہواً چھوٹ گئی۔ اس کی بیوی سے عشق بھی کریں، اس لیے نہیں کہ آپ کا جی چاہے گا، بلکہ اس لیے کہ اس کمینے کو پتا تو چلے کہ کسی دوسرے کے گھر میں مہمان کیسے ہوا جاتا ہے؟

بمبئی کے فلیٹوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ سالے بہت ہی فلیٹ ہیں۔ ان میں اگر آپ ایک چارپائی رکھ دیں تو دو پائے والے کے لیے کہیں کوئی گنجائش نہیں۔ آخر چارپائی تک پہنچنے کے لیے تھوڑی جگہ تو چاہیے ہی۔ بہر حال

وہ کھاٹ جسے آپ کی بیوی جہیز میں لائی تھی اور جسے آپ پلنگ نہ کہیں تو وہ مرنے مارنے کے لیے تیّار ہو جاتی ہے، مہمان کو دینا پڑتی ہے اور خود نیچے سونا پڑتا ہے۔ بد قسمتی سے اگر آپ کے مہمان ساتھ اپنی بیوی کو بھی لائے ہوں تو پھر آپ اوپر سو سکتے ہیں، نہ نیچے۔

ہاں، تو جب آپ مہمان صاحب کو چارپائی پر سونے کے لیے کہیں گے تو پہلے وہ ضرور کہے گا۔۔۔ نہیں صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ پلنگ پر سویئے، میں نیچے سو جاتا ہوں لیکن اس کی نیت ہر گز ایسی نہ ہو گی۔ وہ جانتا ہے نا کہ اس کی خاطر کر کے میزبان اپنے کر تو یہ ہی کا تو پالن کر رہا ہے۔ اس کی اس پیش کش سے انکار کیا تو بے چارے میزبان کے دل پر کیا بیتے گی؟ چنانچہ وہ پلنگ پر ٹانگیں پھیلا کر مزے سے سو جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کو یوں لگے گا جیسے دشمن کا ریڈیو براڈ کاسٹ کر رہا ہے۔ لیکن آپ کوڈ نہ جاننے کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں سکتے۔ پھر آپ کو اچانک خیال آئے گا۔ نہیں بھائی، اس WAVE LENGTH پر تو پہلے ہی بیسیوں نشریات سن چکے ہیں۔ یہ تو مہمان کے خرّاٹے کے ہیں۔

چنانچہ مہمان صاحب سو رہے ہیں۔ ہمیشہ کی نیند نہیں۔ صبح وہ پھر جگ جائیں

گے۔ ایک نہیں نیند آتی تو آپ کو اور آپ کی بیوی کو جو سوچ رہے ہیں کہ کل اِن کو کیا کھلائیں گے؟ آپ سوچتے تو نیلا تھوتھا ہیں اور لاتے سیب ہیں، جن کا منہ بھی مہنگائی کے اس زمانے میں آپ نے مہینوں سے نہیں دیکھا۔ پھل بیچنے والا پیشہ ور آدمی ہے۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی تاڑ جاتا ہے کہ ہو نہ ہو ان کے گھر میں کوئی مہمان آیا ہے اور اتتھی ستکار کی بھاونا ان کے من میں ویاکل ہو اٹھی ہے۔ چنانچہ وہ سیب تو ایک دیتا ہے اور روپے دو مانگتا ہے۔ جیسے اکیلا وہی ایک سیب ہے جو ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کشمیر سے آیا ہے۔ پھر آپ آم خریدنے کا فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ وہ مقابلہ میں سستا پڑتا ہے۔ گھر پہنچ کر آپ اس آم کی بہت سی قاشیں کاٹ کر مہمان کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ انہیں ایک کے دو معلوم ہوں۔ مہمان ایک بار پھر آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ چنانچہ لپڑ چپڑ وہ سارے کا سارا آم چٹ کر جاتا ہے۔ آپ سوچتے ہیں، شاید وہ سمجھ رہا ہے کہ اندر اور بھی بہت سے آم ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اندر صرف بیوی ہے جو غصّے سے کانپ رہی ہے اور اس کی شکل اناناس کی سی ہو گئی ہے۔

مہمان کے گھر میں آنے سے سب سے بڑی بے ہودگی جو ہوتی ہے، وہ آپ کے

سب راز، سب پول کھل جانا۔ آپ گھر میں آدھی کھائیں یا ساری، یا بھوکے ہی سو رہیں، لیکن مہمان کے آتے ہی آپ کی قلعی کھل جاتی ہے۔ آپ کتنا ہی اس سے چھپانے کی کوشش کریں مگر وہ سب ایسے ہی بے کار ہے جیسے کارک کو پانی میں ڈبونے کی کوشش۔ مہمان اس وقت اندر سے خوش لیکن باہر سے اداس دکھائی دیتا ہے اور اکثر یہ جملہ کہتا ہے، ''کیا ہوا بھائی، گھروں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔۔۔''

وہ ہمدردی کر رہا ہے جسے آپ سخت ناپسند کرتے ہیں۔ جب تک آپ پڑوس سے سو روپے کا نوٹ پکڑ سکتے ہیں، کسی کو ہمدردی جتانے کا کیا حق ہے؟ اگر آپ کسی نہ کسی طرح حقیقت حال چھپانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو پھر مہمان بڑے شاطرانہ انداز میں کریدنے کی کوشش کرتا ہے، ''کیوں بھائی! کاروبار کا کیا حال ہے؟'' آپ جواب دیتے ہیں۔ ''اچھا ہے۔''

''کوئی ترقی ورقی نہیں ہوئی؟''

''ہوئی کیوں نہیں۔۔۔ ہر سال ہوتی ہے، جیسے ہر معقول ہندوستانی عورت کے بچہ پیدا ہوتا ہے۔۔۔ ہی۔''

چنانچہ ہنسی میں بہہ جانے کی وجہ سے آپ کو بالکل اندازہ نہیں رہتا کہ آپ کیسے دھیرے دھیرے مہمان کی سازش میں آ رہے ہیں۔ وہ آپ کے بھونڈے مذاق پر آپ سے کہیں زیادہ ہنستا ہے اور اعتراف بھی کرتا ہے کہ اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے اور پھر ایکا ایکی آپ کو پورے طور پہ نہ دیکھتے ہوئے اپنے ترکش سے ایک اور تیر چھوڑتا ہے۔۔۔اب تو تنخواہ تین سو روپے مہینہ ہو گئی ہو گی؟"

آپ کی رگِ حمیّت ایک دم پھڑک اٹھتی ہے اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ آپ اپنے آپ کو کہتے ہوئے پاتے ہیں، "تین سو؟ پانچ سو تو میری پچھلے برس تھی۔۔۔" جبھی آپ کو پتا چلتا ہے کہ آپ نے کیا حماقت کی۔ خود کو کنویں میں گرا کر اب آپ بچنے کے لیے بے کار ہی ہاتھ پیر مارتے ہیں اور کہتے ہیں، "پانچ سو میں آج بنتا ہی کیا ہے؟ کچھ انکم ٹیکس کٹ جاتا ہے، کچھ انشورنس، پراویڈنٹ فنڈ میں چلا جاتا ہے۔ کچھ بیوی کمیٹی کے لیے رکھ لیتی ہے تاکہ اس بیٹی کی شادی کر سکے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی۔۔۔" لیکن صاحب آپ کچھ بھی کیجیے۔ مہمان اندازہ لگا چکا ہے کہ آپ کے گھر میں اور کتنے دن رہا جا سکتا ہے۔

ہر معقول آدمی کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے کیونکہ مرد عورت کا رشتہ ہی جھگڑے کا

ہے۔ لیکن جب مہمان گھر میں آتا ہے تو وہی جھگڑا مہابھارت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بیوی آپ سے کتنی نفرت کرتی ہے، اس کا اس وقت تک پتا نہیں چلتا، جب تک مہمان گھر میں نہ آئے۔ جیسے آپ کو بھولنے کے سوا کچھ نہیں آتا، ایسے ہی بیوی یاد رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ جانے کب کا بغض آپ کے خلاف سینے میں لیے بیٹھی ہے جو مہمان کے آتے ہی پنڈورا باکس کی طرح آپ کے سر پر الٹ دیتی ہے۔ مہمان سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے وہ کہتی ہے۔ ”دیکھیے بھائی صاحب! دن میں چوبیس گھنٹے پان کھاتے ہیں اور اس پہ دودھ کا ایک گلاس نہیں پیتے۔ آپ بتائیے ان کو خشکی ہو گی کہ نہیں ہو گی؟ نہ ناشتے کا کوئی وقت ہے نہ کھانے کا۔۔۔ اب پینے کی نئی لت پڑ گئی ہے۔ اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مہمان آئے اور ان کے پینے کا بہانہ ہو جائے۔۔۔ آج تو میں انہیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی۔“

”کسے؟“ مہمان شرارت سے کہتا ہے۔ بیوی کچھ مُسکراتے اور کچھ شرماتے ہوئے کہتی ہے، ”بوتل کو، اور کسے؟ آپ بھی بالکل نہ پیجئے گا، بھائی صاحب۔“ مہمان تھوڑا گھبرانے لگتا ہے اور لہجے میں وہ پیار لے آتا ہے جو وہ اپنی سگی بیوی کے لیے

کبھی نہیں لایا۔ ”کبھی کبھی پی لینے میں کوئی حرج نہیں، بھابی! مرد لوگ۔۔۔“
بیوی ایکا ایکی میز پر ہاتھ مار کے کہتی ہے، ”نہیں!“

”ہاں۔“ میں جواباً کہتا ہوں اور بوتل ڈھونڈنے چل نکلتا ہوں جو بیوی نے گودریج کی الماری میں چھپا رکھی ہے اور تالا لگا دیا ہے۔ میں کنجی مانگتا ہوں اور وہ ٹھنٹ دکھاتی ہے۔ میں جانتا ہوں چابی کہاں ٹھنسی ہے، لیکن مہمان کے سامنے وہاں سے نکال نہیں سکتا۔ چونکہ میرے شوہری وقار کو ٹھیس لگتی ہے، اس لیے میں آگ بگولا ہو جاتا ہوں اور بیوی کے خلاف زہر اگلنے لگتا ہوں، ”یہ عورتیں۔۔! آپ دو روپے کمائیں اور دیانت دار آدمی کی طرح آتے ہی ایک روپیہ ان کے ہاتھ میں تھما دیں۔ باقی کے روپے میں آپ بس کا کرایہ رکھیں اور صرف اٹھنّی اپنے موج میلے کے لیے، جب بھی ان کی نگاہ آپ کی اٹھنّی پر رہے گی۔ مرد سے یہ آخری سانس تک نچوڑ لیں گی اور جب وہ مر جائے تو اونچی اونچی آواز میں روئیں گی۔ اس لیے نہیں کہ وہ مر گیا ہے، بلکہ اس لیے کہ اب نچوڑیں گی کسے؟“

”بکو مت۔۔۔“ بیوی کی بُلند آواز آتی ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی سانس

دھونکنی کی طرح چلنے لگی ہے۔ ابھی سے اسے فکر پڑ گئی کہ یہ گیا تو روپیہ کہاں سے آئے گا؟ لیکن آپ اپنا ٹیمپو کم نہیں ہونے دینا چاہتے۔ آپ مہمان سے کہتے ہیں۔ ''آپ ہی بتایئے بھائی صاحب۔۔۔ ہر بیوی شادی کے دس سال میں یہ ہو جاتی ہے۔ اس دلہن کو دیکھیے جسے آپ برسوں پہلے گھر لائے تھے اور جس سے والہانہ پیار کیا تھا، دو گھونٹ پینا ضروری ہیں یا نہیں؟ یہ ذلیل سا گھر ہمارا۔۔۔ جب میں پی لیتا ہوں تو مجھے یہ سیچیو الیہ معلوم ہونے لگتا ہے اور یہ گندا سا محلہ ہینگنگ گارڈن!''
پھر میں آنکھوں میں شعلے اور انگارے برساتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں۔ ''دیکھو شانتی! مجھے آکاش وانی ہو رہی ہے۔''

بیوی آکاش وانی کا مطلب سمجھتی ہے، اس لیے ڈر کے مارے چابی میرے ہاتھ میں تھما دیتی ہے لیکن اس کے بعد جو ہتھیار میرے خلاف استعمال کرتی ہے، اس کے سامنے آکاش وانی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ رونے لگتی ہے اور مہمان سے مخاطب ہوتی ہے۔ ''آپ کو کیا بتاؤں بھائی صاحب! جب یہ پی لیتے ہیں تو آدمی نہیں رہتے۔''

''کیا ہو جاتے ہیں؟'' وہ پوچھتا ہے۔ بیوی ہچکچاتے ہوئے کہتی ہے۔ ''باہر جاتے

ہیں۔"

"باہر جانے میں کیا حرج ہے؟" مہمان عارفانہ تجاہل کے ساتھ کہتا ہے۔"باہر کی کھلی ہوا۔۔۔"

"اوہو۔ آپ نہیں سمجھتے۔"

"او۔۔۔" مہمان کہتا ہے، جیسے وہ سمجھ رہا ہے۔

"آپ ایسے نہیں، تو سمجھتے ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی مرد ایسا نہیں؟" اور پھر گھگھیا کر رونے لگتی ہے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ ذلیل اور گھٹیا مہمان ہم میاں بیوی پہ جج بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ بیوی مجھے نقطوں سے بھری ہوئی گالیاں دیتی ہے اور میں اسے بے نُقط سناتا ہوں۔ مہمان بیچ بچاؤ کرتا ہے۔ باہر سے دکھی مگر اندر سے سکھی نظر آتا ہے۔ آخر وہ مجھے بے تحاشہ صلواتیں سنانے لگتا ہے۔ "شرم آنی چاہیے آپ کو۔ ہم نے ہزاروں عورتیں دیکھی ہیں لیکن شانتی ایسی دیوی نہیں دیکھی۔ آپ اگلے سات جنم تک بھی لگے رہیں تو ایسی ستی ساوتری آپ کو نہ ملے گی۔"

”اگلے سات جنم؟ میں پچھلے سات جنم سے لگا ہوا ہوں۔“

”کیا کہا؟“

”پچھلے سات جنم سے ستی ساوتری کی تلاش میں ہوں، اور اب جا کر مجھے یہ ملی ہے شانتی۔ اب تو مجھے موکش ملنے والا ہے۔“

بیوی عقیدت کے ایک جذبے سے مہمان کی طرف دیکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس گھر میں مہمان کی نوکری پکی۔ یہ تو موٹی عقل کا مہمان بھی جانتا ہے کہ کسی کے گھر میں رہنا ہے تو بیوی کے ساتھ بنا کر رکھو۔ اب وہ مجھے اور بھی برا بھلا کہنے لگتا ہے۔ بیوی چونکہ مرد کا EGO ہوتی ہے، اس لیے میاں اوپر سے بے حد خفا ہوتا ہے اور بھیتر سے خوش۔ بیوی کے سلسلے میں اسے کھانا کھا کر اتنی خوشی نہیں ہوتی، جتنے جوتے کھا کر ہوتی ہے۔ ہر بیوی کسی انتقامی جذبے سے چاہتی ہے کہ مرد کو وہ بے بھاؤ کی پڑیں کہ نانی یاد آ جائے اور پھر وہ بے دست و پا ہو کر اس کی شرن میں چلا آئے۔ جب وہ اسے ایسا پیار دے جو ماں ہی اپنے بچّے کو دے سکتی ہے، جب وہ پڑوس کے کلوا سے پٹ پٹا کر گھر آتا ہے۔ لیکن آپ کا مہمان تھوڑی ہی دیر میں آپ کا سب مزا کرا کر دیتا ہے۔ وہ آپ کو آنکھ مار کر

ایک طرف لے جاتا ہے اور بالکونی پر لے جا کر بڑی رازداری سے کہتا ہے۔
”آپ بھی ایک ہی پٹنگ ہیں۔ ہوتی میری بیوی تو ایک جھانپڑ دے کر گھر سے نکال دیتا۔“

مہمان کو گھر سے بھگانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کے کپڑوں پہ سیاہی انڈیلنے، روٹی میں ریت ڈالنے، گھر کا مین سوئچ آف کر دینے کے سب طریقے پرانے ہو چکے ہیں۔ جدید طریقہ یہ ہے کہ خود ایک دم گھبرا جاؤ، جس سے آپ کا مہمان بھی گھبرا جائے گا۔ اس کی اتنی خاطر کرو کہ وہ توبہ توبہ بول اُٹھے۔ اس کا پاؤں ہی زمین پر نہ پڑنے دو۔ اس کے منہ سے ’پ‘ نام کا حرف نکلے تو دوڑ کر پانی کا گلاس لے آؤ۔ پلنگ پر بیٹھا وہ زمین کی طرف دیکھے تو سلیپروں کی جوڑی اٹھا کر سامنے رکھ دو۔ وہ آپ سے بار بار معافی مانگے گا۔ لیکن اس بات کا آپ پہ ذرا بھی اثر نہ ہو۔

باتھ روم کا بٹن آپ دباؤ۔ نل بھاگ کے کھولو اور ایسے میں دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لو۔ غلطی سے کہیں وہ خود ہاتھ دھونے لگے تو ایک تولیہ لے کر کھڑے رہو۔ ٹٹّی کا لوٹا خود ہاتھ میں لے کر سامنے بیٹھ جاؤ اور اس کے منّت کرنے پر بھی

نہ ٹلو۔ لیکن یاد رہے یہ سب نسخے باریک عقل کے مہمانوں پر چلتے ہیں، موٹی عقل کے مہمانوں پر نہیں۔ پچھلے مہمان کو میں باریک عقل کا سمجھتا تھا لیکن وہ موٹی عقل کا نکل آیا۔ میرے یہ سب کرنے کے بعد اس نے منڈی ہلائی اور کہا۔

”آپ بڑے دیوتا آدمی ہیں۔“

جب میری سمجھ میں آیا کہ میں کیا ہوں؟

پھر مہمان کے ساتھ جو اس کی بیوی آتی ہے، وہ عجیب ہی چیز ہوتی ہے۔ نہ جانے آپ کیسے اسی وقت اندر کے کمرے میں جاتے ہیں، جب وہ کپڑے بدل رہی ہوتی ہے۔ وہ آپ کو دیکھتے ہیں ہڑبڑا کر ایک طرف بھاگتی ہے۔ آپ کھڑکھڑا کر دوسری طرف۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی رہی سہی ساری بھی کھل جاتی ہے اور جب آپ دونوں سخت وحشت کے عالم میں الٹی سمتوں میں بھاگتے ہیں تو نہ جانے کیسے پھر برآمدے میں ٹکرا جاتے ہیں۔ آخر بڑی مشکل سے آپ اپنے ہونٹ پونچھتے ہوئے الگ ہو جاتے ہیں۔۔۔

مہمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ایوالانش بھی آتی ہے جس کا نام بچّے ہیں اور جو شکل ہی سے مہمان کے بچّے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ بچّوں سے

پیار کرنا چاہیے کیونکہ وہ پرماتما کے راج بھوت ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیجیے کہ چھوٹے نلی چو چو کی ناک بہہ رہی ہے، جسے وہ ہمیشہ اپنی قمیص کے کف سے پونچھتا ہے۔ بڑا باہر سے کھیلتا ہوا آتا ہے اور اپنے کیچڑ سے لت پت پاؤں دوان پر رکھ دیتا ہے۔ ان کی ماں رسمی طور پر انہیں ڈانٹتی ہے۔ لیکن آپ کہتے ہیں۔ ”بچّے ہیں بھابی۔ یہ تو ایسے ہی کریں گے جیسے بچّے کرتے ہیں۔ انہیں روکنا بڑی غلطی ہے۔“ یہی نہیں، آپ اپنے علم کے زور پر اسے بتاتے ہیں کہ بچّے تھوڑی بہت توڑ پھوڑ نہ کریں تو ان میں تخریبی جذبے دَب جاتے ہیں اور اس وقت نکلتے ہیں، جب وہ بڑے ہو جائیں لیکن یہ بات تو آپ بھی نہیں جانتے کہ آج کل کے بچّے، آپ کی سب بات سمجھ رہے ہیں۔

ابھی آپ نے کھانے کے لیے لقمہ منہ میں نہیں رکھا کہ اڑڑڑڑ دھڑام کی آواز آتی ہے۔ آپ سب بھاگتے ہوئے بغلی کمرے میں پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ لینن کا بت جو آپ لینن گراڈ ہی سے لائے تھے، زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور نلی چو چو پاس کھڑا کچھ فاتحانہ، کچھ مجرمانہ انداز سے ہنس رہا ہے۔ ہے ہے ہے۔۔۔ اب ماں دکھاوے کے لیے تھپڑ مارتی ہے لیکن صاف پتا چلتا ہے کہ وہ

کس پھولوں کی چھڑی سے اس کی تواضع کر رہی ہے۔ اب آپ ہیں اور آپ کی بیوی جو اسے چھڑا رہے ہیں۔ آپ کا انتا کرن تو کہتا ہے سالے کو ننگا کر کے، ٹکٹکی لگا کر وہ بید مارو کہ چمڑی اُدھڑ جائے لیکن اوپر سے آپ یہی کہتے ہیں۔ "کیا ہوا بھابی؟ بچّے تو توڑیں گے ہی۔ میں نے آپ سے کہا نہیں تھا۔۔؟ چھوڑو اب مار ہی ڈالو گی معصوم کو؟" پھر چھڑانے کی بجائے اسے آگے دھکیلتے ہوئے آپ کہتے ہیں۔ "روس والے اب مجھے REACTIONARY سمجھنے لگے ہیں ورنہ میں ایک اور بت ماسکو سے لے آتا۔"

بجلی مجھ پر اس وقت گرتی ہے جب میرا مہمان اور اس کی بیوی دونوں مل کر بچّے سے کہتے ہیں، "نمستے کرو، نمستے کرو انکل کو۔۔۔ ارے کنگ۔" اب کنگ ماں کی دھوتی پکڑ کر اس کے پیچھے چھپنے لگتا ہے اور مشکوک انداز سے آپ کی طرف دیکھتا ہے اور بڑی ادا سے کہتا ہے،۔ "نائیں۔۔۔" بچّے کا باپ اسے پکڑتے، سامنے لاتے ہوئے کہتا ہے۔ "ارے، نمستے کر سالے، انکل چاکلیٹ دیں گے۔" جبھی ماں اتراتی ہے۔ "میرا کنگ چاکلیٹ بہت پسند کرتا ہے۔" آپ فوراً کہتے ہیں۔ "چاکلیٹ لے دوں گا بیٹے۔ اور ٹافی بھی۔" حالانکہ انتا کرن کہتا ہے

تھوڑا۔۔۔ پوٹاشیم سائنائیڈ بھی۔ میں پھر شروع ہوتا ہوں، ”تمہارے لیے غبارہ لاؤں گا کنگ! بہت بڑا غبارہ۔۔۔ نمستے۔۔۔“

”ہی ہی ہی۔ نمشتے!“ آخر کنگ کہتا ہے۔ پھر اس کا باپ شروع ہوتا ہے، ”یار کنگ، انکل کو اے بی سی ڈی سناؤ۔“ کنگ انکار میں سر ہلا دیتا ہے اور پھر ماں کے پیچھے چھپنے لگتا ہے۔

”ارے سناؤ نا، شرما کیوں رہے ہو؟“ ماں اسے پھر سامنے لاتے ہوئے کہتی ہے، ”انکل سائیکل لے کر دیں گے۔“

”ہاں۔۔۔“ میں کہتا ہوں۔ ”کار لے دوں گا۔“

جب کنگ فارم میں آتا ہے اور کہتا ہے۔ ”چابی والی کار نائیں، انکل! وہ والی۔“ اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ وہیل کی شکل بناتا ہے۔ آخر میرے وعدہ کرنے پر وہ شروع ہوتا ہے۔ ”اے۔۔۔ بی۔۔۔ شی۔۔۔ ڈی۔۔۔ ای۔۔۔ ہی ہی، مجھے سوسو آیا ہے ممّی۔“

”ارے!“ ممّی یوں اظہار کرتی ہے، جیسے کوئی اَن ہونی بات ہو گئی۔

"چل اندر۔"

اور وہ وہیں سے اس کا ازار بند کھولتی ہوئی کنگ کو باتھ روم کی طرف لے جاتی ہے۔ لیکن جاتے میں یہ بھی کہہ جاتی ہے، "بالکل باپ پر گیا ہے، کام کے وقت سو سو۔۔۔" باپ ہنستا ہے۔ میں بھی ہنستا ہوں۔ میری بیوی ہنستی ہے۔ ساری دنیا ہنستی ہے۔

ہمارا مہمان پھر شروع ہوتا ہے۔ "بڑا ذہین ہے اپنا کنگ!"

"کیوں نہ ہو۔" میں اتفاق کرتا ہوں، "ذہین ماں باپ کی اولاد۔۔۔" حالانکہ میرا انتاکرن کہتا ہے گدھے کا بچہ گدھا ہی ہو گا، گھوڑا کیسے ہو جائے گا؟ جبھی ایک طرف سے کوئن چلی آتی ہے۔ انگریزی GENDER کے سب قانون جھٹلاتی ہوئی، کیونکہ وہ کوئن ہونے پر بھی کنگ کی بہن ہے۔ وہ اپنے بھائی کی ہر دل عزیزی دیکھتی اور جلتی رہی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ کسی پتری پاٹھ شالہ میں پڑھتی ہے، سامنے آتے ہی وہ بنا کسی فرمائش کے، ایک پرانا، بے سرا سا گانا شروع کر دیتی ہے، "ہئیے دیا مئے، ہم سبھوں کو شدھتائی دیجیے۔۔۔"

میں بھجن سنتا ہوں لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنی تائی یاد آ جاتی ہے، جو بہت ہی شدھ ہے۔۔۔ میں اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے کوئن کو بیچ میں ٹوک دیتا ہوں اور کہتا ہوں، ''واہ، کیا گلا پایا ہے۔۔۔ بڑی ہو گی تو لتا منگیشکر سے کم کیا ہو گی؟'' اور میرے انتا کرن سے آواز آتی ہے۔ مینڈک کی اولاد! لیکن کوئن بدستور گا رہی ہے۔ انترہ پہلے اور استھائی بعد میں اس سے بھجن اور بھی مؤثر ہو جاتا ہے۔

''ایسی کرپا اور انوگرہ ہم پہ ہو پرماتما۔''

چونکہ وہ بچّی ہے، اس لیے بھلائی اور برائی میں تمیز نہیں کر سکتی اور بڑی نمرتا سے پرارتھنا کرتی ہے۔ جس سے وہ پرانا اور فرسودہ گانا نیا اور ماڈرن ہو جاتا ہے۔

''دور کر کے ہر بھلائی کو برائی دیجیے!''

اتنے میں کنگ فارغ ہو کر چلا آتا ہے اور کوئن کو گاتے دیکھ کر شروع ہو جاتا ہے۔ ''میں بھی سناؤں گا اُردُو کا سبق۔''

''ارے سناؤ، سناؤ کنگ۔۔۔ یار کنگ تم تو۔۔۔'' ہم سب کہنے لگتے ہیں۔ اب کنگ ایک ہی سانس میں سبق سنا جاتا ہے۔ ''بچھو سے کسی نے پوچھا تو جاڑے میں

باہر کیوں نہیں آتا؟ بچھو نے کہا گرمیوں میں مری کون سی خاطر ہوتی ہے جو جاڑے میں بھی باہر آؤں؟" اور پھر کنگ یک بارگی اُلٹا سانس لیتا ہے۔ہا۔۔۔!

آخر ایک دن ہمیں آناً فاناً پتا چلتا ہے کہ ہمارے مہمان جانے والے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ پہلے ہی سے ہمیں اپنے سر گباش ہونے کی خبر دے دیتے ہیں بلکہ کچھ یوں کہ اس سہانی صبح کو ہمارا مہمان ہمارے پاس آتا ہے، محبّت بھرا ہاتھ ہمارے کاندھے پہ رکھ دیتا ہے اور آہستہ آہستہ خود سرکتا ہمیں سرکاتا ہوا، بالکونی کی طرف لے جاتا ہے اور کھُسر پھُسر کے انداز میں بات شروع کرتا ہے۔ "بات یہ ہے، میں نے بینک میں ایک چیک ڈالا تھا۔۔۔" میں ایکا ایکی سب سمجھ جاتا ہوں اور اسی وقت پوچھتا ہوں، "کے روپے چاہییں آپ کو؟" وہ کہنے لگتے ہیں۔ "میں دلی پہنچتے ہی آپ کو لوٹا دوں گا۔"

اب میں اپنے مہمان کو یہ نہیں بتا سکتا کہ جو آدمی مجھے پیسا لوٹانے کی بات کرتا ہے، میرا اس کے منہ پہ طمانچہ مارنے کو جی چاہتا ہے۔ خیر وہ تو میرا انتا کرن ہے۔ میں اسے صرف اتنا ہی کہتا ہوں، "ارے یار، تم نے آتے ہی کیوں نہ مانگے۔۔۔ کتنے چاہئیں؟"

”زیادہ نہیں۔“ وہ کہتے ہیں۔ ”یہی تین اِک سَوروپے۔“

میں فوراً بھاگا ہوا اندر جاتا ہوں اور اپنی بیوی کے پاؤں پر سر رکھ دیتا ہوں اور اس سے تین سوروپے لاکر مہمان کو دے دیتا ہوں۔ وہ کچھ کھسیائے ہوئے انداز میں مجھے تکلیف دینے کی معذرت چاہتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ میں اندر سے کتنا خوش ہوں۔ بھلا مہمان، اس کے لاؤ لشکر۔ کنگ کوئن، پرنس رائل اور اس کے پورے شاہی خاندان سے چھٹکارا پانے کی تین سوروپے بھی کوئی قیمت ہے؟

فلم بنانا کھیل نہیں

فلم یوں تو کھیل ہے، لیکن اس کا بنانا کھیل نہیں۔ ارادے اور روپ ریکھا سے لے کر فلم بنانے تک بیچ میں بیسیوں، سیکڑوں ایسی رکاوٹیں آتی ہیں کہ بڑے دل گردے والا آدمی بھی دم توڑ سکتا ہے۔

سوشل فلم باقی دوسری فلموں سے الگ نہیں، لیکن زیادہ مشکل اس لیے ہے کہ سماج مختلف قسم کا ہے۔ کئی مذہب، نسل، صوبے، بولیاں ٹھولیاں ہیں۔ جمہوری نظام نے انفرادی طور سے سب کو بنیادی حقوق دے رکھے ہیں اور مجموعی طور پر

برابری کے حقوق۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان حقوق کے خلاف ہوں، لیکن ایک بات ضرور ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور سے ابھی میرے بھائیوں کو ان حقوق کا استعمال کرنا نہیں آتا۔

مجھے یاد ہے، جب میں نے فلم 'مرزا غالب' لکھی تو اوّل اور آخر ہمارے سامنے مقصد یہ تھا کہ دیش کے کونے کونے میں مرزا غالب کا کلام گونجے۔ لوگ ان کے خیالات اور ان کی شاعری کی عظمت سے روشناس ہوں۔ کہانی تو ایک بہانہ ہوتی ہے، جس کی مدد سے آپ اس عہد کے سماج کی پرچھائیاں قلم بند کرتے ہیں۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں۔ "آواز اٹھی اور نہ آنسو بہے۔ شہنشاہِ ہند کی حکومت جمنا کے کنارے تک رہ گئی۔"

مغل عہد ختم ہو رہا تھا اور برٹش سامراجیت دھیرے دھیرے اپنے پنجے پھیلا رہی تھی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مرزا صاحب جب جیل سے رہا ہو کر اپنی محبوبہ کے یہاں آتے ہیں اور دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو کوئی جواب نہیں آتا۔ اس وقت وہ ایک سادہ مگر دُکھ بھرے جملے میں اس عہد کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ "ارے کہاں ہو دلّی والو۔۔۔؟ دن دہاڑے ہی سو گئے؟" اس پر بھی کچھ لوگوں کو

سوجھی کہ مرزا صاحب کی عشقیہ زندگی کیوں پیش کی گئی؟ جیسے وہ انسان نہیں تھے، ان کے دل نہیں تھا۔ وہ کتنے دل والے تھے، ان کے خطوط پڑھ کر پتا چلتا ہے۔

تاریخی فلموں کا ذکر محض تذکرہ ہے، کیونکہ حقیقت میں وہ کسی نہ کسی طرح سماجک پہلو لیے ہوئے ہیں۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے ساتھ کسی نہ کسی مقصد کا اشارہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مہاراج رنجیت سنگھ کے بارے میں فلم بنانا آسان نہیں ہے۔ حقیقت سے متعلق دو مؤرخوں کی رائے آپس میں نہیں ملے گی۔ پھر وہ مقصد ان کی زندگی کے انفرادی پہلو کو فلم کے پردے پر نہیں لانے دے گا۔ آپ کو کئی اداروں سے کلیرنس حاصل کرنا ہو گا اور جب وہ حاصل ہو گا تو اسکرپٹ کی شکل بالکل بدل چکی ہو گی، جس میں آپ اپنا چہرہ پہچان ہی نہیں پائیں گے۔ کچھ اس قسم کی باتیں ہو جائیں گی۔۔۔ آپ بہت اچھے ہیں، میں بھی بہت اچھا ہوں۔ تندرستی ہزار نعمت ہے، وغیرہ وغیرہ اور اگر آپ ان کے شکوک کے خلاف جائیں گے تو مورچے لگیں گے، آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور آپ گھر کے باہر نہیں نکل سکیں گے۔

آپ زیب النساء کے بارے میں فلم نہ ہی بنائیں تو اچھا ہے، کیونکہ وہ اورنگ زیب کی بیٹی تھی اور اس لیے سیزر کی بیوی کی طرح تمام شکوک اور شبہوں سے اوپر۔ عاقل خان گورنر ملتان سے ان کی محبّت کو نہ صرف مشکوک سمجھا جائے گا، بلکہ اس کی صحت، میرا مطلب ہے، قصّے کی صحت کو بیہودہ قرار دیا جائے گا۔ آپ دور کیوں جاتے ہیں، حال ہی میں ستیہ جیت رے نے، جنہیں دنیا ایک بڑے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مانتی ہے، ایک فلم بنائی جس میں ایک نرس دکھائی گئی جو اپنے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر رات کو دھندا کرتی ہے۔ اب وہ ایک انفرادی بات تھی جس کا اجتماعی طور پر نرس پیشہ عورتوں سے کوئی تعلّق نہیں تھا۔ پر اس پر بھی ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نرسوں نے آندولن چلایا اور شری رائے کو ان سے معافی مانگنی پڑی۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف لوگ مرزا غالب، اور 'سنسکار' جیسی فلموں کے خلاف مظاہرے کرتے ہیں اور دوسری طرف بھارت سرکار انہیں سال کی بہترین فلم قرار دیتی ہے۔ اس کے بنانے والے کو راشٹر پتی اپنے ہاتھوں سے سورن پدک اور مان پتر پیش کرتے ہیں۔

ساماجک فلم اپنے یہاں بنانے میں اپنے یہاں دیش کے حالات بہت آڑے آتے ہیں۔ مختلف گروہ، قومیں اور مقصد تو ایک طرف، خود سرکار بھی اس گناہ سے بری نہیں۔ مثال کے طور پر سرکار کی پالیسی اہنسا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجیے گا کہ کئی ہنسا استعمال کرنے والوں کو ہم نے اپنا رہنما مانا ہے، ان کے سامنے سر جھکایا ہے اور اس کے سہرے گائے ہیں۔ میں شہید بھگت سنگھ کی مثال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ شہید بھگت سنگھ اوّل اور آخر کرانتی کاری تھے، وہ من سے سوشلسٹ تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ طاقت کے استعمال کے بنا برٹش سامراجیہ کا تختہ اُلٹنا ممکن نہیں ہے۔ اب آپ ان کے بارے میں فلم بنائیں تو ایک طرف اُن کو اُن کے ساتھی بھگوتی چرن ورما کی بیوی کو بار بار بھابی کہہ کر پوشیدہ سیکس کی طرف اشارہ کرنا پڑے گا اور دوسری طرف اُن کے اسمبلی میں بم پھینکنے کے واقعے کو یا تو چھوڑ دینا ہو گا اور یا پھر اس کا بیان یوں کرنا ہو گا کہ وہ صرف سامراجیہ کو چونکانا چاہتے تھے۔

تبھی ایک اندرونی تضاد پیدا ہو جائے گا۔ کیا لاہور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سانڈرس کی ہتھیا بھی انہوں نے انگریزوں کو چونکانے کے لیے کی تھی؟ اگر آپ

ان واقعات کو ایسے ہی دکھائیں گے جیسے کہ وہ واقع ہوئے تو آپ حملوں کا نشانہ بنیں گے، کیونکہ ملک میں کئی ایسے گروہ ہیں جو گولی بندوق میں یقین رکھتے ہیں اور سرکار کی پالیسی ایسی ہے کہ وہ دھماکہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ورنہ ان کروڑوں نوجوانوں کا کیا ہو گا جو دن رات یونیورسٹی کیمپس میں اُدھم مچاتے رہتے ہیں۔

یہ تاریخ کو چڑانے والی بات ہو گی کہ ہم کہیں کہ ہندوستان کو آزادی صرف اہنسا کی پالیسی کی وجہ سے ملی۔ اس میں رائل نیوی کے ناوِکوں کا بھی ہاتھ تھا جنہوں نے گھٹیا قسم کے کھانے اور بدسلوکی کا بہانہ لے کر ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑائی لڑی، مخالفت کی اور بمبئی کی گلیوں میں انگریز کی گولیوں سے شہید ہوئے۔ جلیاں والا باغ کے بیسیوں سال کے بعد اُدھم سنگھ نے لندن پہنچ کر مائیکل اوڈائر کو گولی مار دی اور ہماری قومی بے عزّتی کا بدلہ لیا۔ لیکن آپ اس سوشل اور تاریخی سچ کو مُصیبت میں آئے بغیر نہیں دِکھا سکتے۔ اس لیے کہ برطانیہ کے ساتھ ہمارے کامن ویلتھ تعلقات ہیں، جو موجودہ بین الاقوامی حالات کو دیکھتے ہوئے ہم کسی طرح نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم حقیقت کی آنکھوں میں نہیں گھور سکتے۔

سوشل فلم بناتے وقت ہم ہر ہر قدم پر ایسے بیسیوں خطروں سے دو چار ہوتے ہیں۔ آپ قومی ایکتا پر فلم بنا رہے ہوں تو آپ میں ہمّت نہیں ہو گی کہ رانچی، بھیونڈی اور مالیگاؤں کے واقعات کو ان کی صحیح صورت میں پیش کر سکیں، کیونکہ ان میں ایک مذہب یا قوم کے لوگوں نے دوسرے پر وحشیانہ ظلم ڈھائے تھے۔ آپ ہندو مسلم فساد دکھاتے ہیں تو آپ کے لیے ضروری ہے کہ جہاں دو ہندو مرے ہوں وہاں دو مسلمان مار کے دکھائیں۔ اس پر بھی نہ ہندوؤں کی تسلّی ہو گی نہ مسلمانوں کی۔ دونوں آپ سے ناخوش، دونوں ناراض اور اس پر آپ کو سنسر سرٹیفکیٹ لینے میں تکلیف ہو گی۔

تو یہ آپ طلبہ کے موجودہ ایجیٹیشن کو بھی نہیں ٹٹول سکتے۔ ان کے دنگوں اور مخالفت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کر سکتے۔ یونیورسٹی کیمپس میں آج جو ہو رہا ہے، آخر ہے کیا؟ وہ اپنا اصل مقصد چھوڑ کر سنیاسی ہوتے جا رہے ہیں یا وہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے ہتھکنڈوں کا شکار ہیں؟ آخر اس مار دھاڑ کی وجہ کیا ہے؟ یہ بھی تو گاندھی جی کو مانتے ہیں۔ پھر کیوں یہ لوگ ایکا ایکی اُمڑ کر مار کاٹ کرنے لگتے ہیں؟ ان باتوں کی تہہ میں جانا اور ان کے بارے میں فلم بنانا مشکل ہی نہیں،

ناممکن ہے۔ ایسا کریں گے تو کئی ہزاروں کے پاؤں پر آپ کے پاؤں پڑیں گے اور وہ سب ہیں بڑی پہنچ والے۔ اس لیے آپ صرف گول گول دال والی بات کیجیے۔ پانچ چھ گانے ڈال دیجیے، دوچار ناچ، ماں باپ، بیٹے بیٹوں کو بچپن ہی سے بچھڑا دیجیے تاکہ بڑا بھائی جوان ہو کر پولیس انسپکٹر ہو جائے۔ انجانے ہی میں اپنے چھوٹے بھائی کو ملزم کے طور پر عدالت میں پیش کرے اور یہ بعد میں پتا چلے کہ جج ان دونوں کا باپ تھا اور ماں جو بیٹے کے خلاف گواہی دے رہی ہے، اس کی بیوی تھی۔ پھر تو باپ کے لیے مشکل ہو جائے، ماں کے لیے مُصیبت۔

نوجوانوں کے بارے میں فلم بنایئے تو صرف یہیں تک پہنچیے کہ بڑوں کا عشق، عشق تھا اور چھوٹوں کی محبّت بدنامی اور بدکاری۔ اُسے 'اُچت' مت لکھیے کہ شری مدبھاگوت سے لے کر اب تک استری اور پرشوں کے بیچ کیا کیا گردانیں ہوئیں۔ صرف اتنا ہی کافی ہے کہ چند مصیبتوں میں پڑے بڑوں کے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔ وہ انہیں سیاسی اور رہنما نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو اپنے ہی الٹے معنی پہناتے ہیں۔

اب آپ اس بدنام لفظ 'سیکس' پر آجایئے۔ ہمارا سماج یہ تو سہن کر سکتا ہے کہ لڑکا

اور لڑکی ناچتے ہوئے ایک پیڑ کے گرد یا موٹر میں بیسیوں چھچھوری اور اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کریں، لیکن باغ میں جو پیار کرنے والے کا اپنی محبوبہ کو پہلا اُپہار ہے، وہ اسے برداشت نہیں کرسکتے۔ ہم اپنی فلموں میں دو، تین، چار ریلیں صرف یہ ثابت کرنے کے لیے لیتے ہیں کہ راجو کو رادھا سے محبّت تھی۔ لیکن نفسیاتی بات جو چند سیکنڈ میں ثابت ہو سکتی ہے، پورا معاشرہ اس کے خلاف ہے، ہمارا سماج اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ کھجوراہو، کونارک کے وارث یہ بات کہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں۔۔۔ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اِس عمل کو ڈھکے چھپے ڈھنگ سے پیش کیا جائے اور فلم جو کسی حد تک آرٹ بھی ہے، کمرشل اور پیشہ وروں کے ہاتھوں سے نکلتی جائے۔

لیکن عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ چند مناظر کو فلمانے کی اجازت اچھے اور بڑے فلم سازوں کو یکساں نہیں ہے۔ یوں سنسر نے اپنے لیے گنجائش رکھی ہے کہ ہر فلم اور اس میں ہونے والے واقعات کو بنانے والے کی نیّت اور واقعے کی نوعیت میں دیکھا جائے گا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک لمحے کے لیے مان بھی لیا جائے کہ سنسر کے چودھری بڑے دل والے ہیں، مگر اُن کا کیا کیجیے گا جو پبلک کی

سطح پر تصویر کو پاس کرنے کے سلسلے میں پہلے دیکھتے ہیں اور جن کا ادبی ذوق قابلِ غور ہے اور جو بار بار اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ”میں فلم نہیں لکھتا، نہ دیکھتا ہوں۔“

مثال کے طور پر میں ایک فلم بناتا ہوں جس کا بنیادی خیال ہے کہ بالغ ہوتے ہوئے بچّے کو جنسی تعلیم دینی چاہیے اور اسے ان تمام خطروں سے آگاہ کرنا چاہیے جو پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب صاف ہے کہ اگر میں لڑکے اور لڑکی کے سلسلے میں کوئی لغزش نہیں دکھاؤں گا تو ڈرامہ پیدا نہیں ہو گا اور دکھاؤں گا تو اس کا حل مجھے وہی پیش کرنا پڑے گا جو مقبول ہے اور وہ نہیں جو نفسیاتی ہے۔

حال ہی کی بات ہے، میں ایک فلم بنا رہا تھا، جو نفسیاتی تھی۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک عورت کا شوہر کسی اور لڑکی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد اس عورت کے ایک بچّی پیدا ہوتی ہے۔ جوان ہو کر وہ شادی کرتی ہے، پر ماں بیٹی کے ساتھ یوں چپک جاتی ہے کہ داماد کے لیے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی اور داماد کو ایک دوسرے کے بازوؤں میں دیکھ لیتی ہے اور ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو اپنی بیٹی کی جگہ

پروجیکٹ کر دیتی ہے۔

انسان اپنے دماغ میں کئی بار ایسی ایسی باتیں سوچ لیتا ہے جو ساماجک اور اخلاقی نظریے سے قبول نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سمجھ لیتا ہے، چاہے اس کے بعد وہ اپنے آپ کو بہت بڑا پاپی اور گناہ گار سمجھے۔ اس لیے ایسا ہی ہوتا ہے، ساس ایک لمحے کے لیے رُک تو جاتی ہے، پر فوراً ہی چونک کر پیچھے ہٹ جاتی ہے اور احساسِ گناہ سے اوت پروت مندر میں جاکر بھجن گانے لگتی ہے

'مورے تو گردھر گوپال دوجا نہیں کوئے۔'

اس سین کو فلمایا تھا کہ میری ہیروئن نے اس پر اعتراض کیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہوتا ہے میڈم۔ اور پھر جب میں یہ دِکھلاتا ہوں کہ وہ ایک گنہگار ہونے کے جذبے سے شرمندہ ہو کر سیٹ سے چلی جاتی ہے تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟" میڈم نے وہ سین کر تو دیا، پر سوچتی رہی کہ اس پر پبلک سے جوتے پڑیں گے۔ میں نے اس پر بھی کہا کہ جوتے جو پڑیں گے، آپ مجھے بھیج

دیکھیے، میرے اپنے جوتے پرانے ہوگئے بلکہ پھٹ چکے ہیں۔

سوشل فلم بنانے والے کی حیثیت اس عورت کی طرح ہے جو غرارہ پہنے ہوئے کسی پارٹی میں گئی اور جب لوٹی تو برسات ہو چکی تھی اور گھر کے سامنے پانی ہی پانی تھا۔ اس کے مرد نے سروالٹر ریلے کی طرح راستے میں اینٹیں اور سِلیں رکھ دیں اور وہ غرارے کو سنبھالتی ہوئی چلی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ایک اینٹ ٹیڑھی رکھی ہوئی ہے۔ وہ دھپ سے پانی میں گِری۔۔۔ غرارے سمیت! ساو دھانی اُسے لے ڈوبی۔

نا بابا۔ سماجک فلم بنانے میں بڑی جوکھم ہے۔ چاروں طرف سے آپ ننگے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بدن پر کھال بھی نہیں اور نمک کی کان سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ فلمیں ساماجک اور دوسری کن حالات میں بنتی ہیں، اس کا آپ کو اندازہ نہیں۔ نام کی ہمیں پوری آزادی ہے مگر اس کے بعد جو مراحل پیش آتے ہیں، اس عالم میں مجاز کا شعر یاد آجاتا ہے:

حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے

کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

گیتا

میں خفا ہوں، بے حد خفا!۔۔۔ انسان سے، دیوی سے، خدا سے اور اس تجاہل سے جسے انسانیت کا ایک بہت بڑا حصّہ، خدا کے نام سے یاد کرتا ہے۔

خفا ہونے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔؟ آپ ایک مورتی کی پوجا کرتے ہیں۔ اسے اپنے سے، انسان سے بڑا درجہ دیتے ہیں اور مقامی طور پر اسے اپنے لیے آخری حقیقت سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک دن وہ مورتی اپنے ٹھکانے پر سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے میں آپ کس سے شکایت کریں گے؟ کسے کوسنے دیں گے؟ کیا آپ

ساکن چیزوں میں حرکت کی پیچیدہ حسابی مساوات اور اس کی اقلیدسی شکلوں میں اُلجھیں گے، یا اس سائنسی حقیقت پر سر دُھنیں گے کہ پتھّر نہ صرف زندگی رکھتا ہے بلکہ بہت دور کا ایک نامحسوس اور استھول سا ارادہ بھی؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ پتھّر نے کسی اندرونی تحریک سے خود کو گِرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہو؟

دانائے راز ان باتوں کا کیا جواب دے سکتا ہے، سوائے اس بات کے کہ وہ چُپ رہے اور دنیا کی سب بے وقت اور 'مہمل' موتوں کے دکھ کو کہیں دور 'دل کے اندر' اپنے آفاقی غم کا حصّہ بنا لے۔ پھر ہکسلے کے ٹھٹھولیے پائلٹ کی طرح سے آگے گزر جائے اور اس منزل پر پہنچ کر انتظار کرے جہاں وقت کی حدیں بس ہو جاتی ہیں اور انسانی خفگی، عقلِ کل سے سوال کرتی اور اس کا جواب پاتی ہے۔

گیتا کو اس وقت موت نے آلیا، جب وہ زندگی کے اوج پر تھی۔ چیچک سے بچنے کے لیے اسے کئی بار ٹیکہ لگوانے کے لیے کہا گیا، لیکن اس نے ہمیشہ انکار کر دیا، کیونکہ اس کے والد کو انسان کی اس چارہ جوئی کے باوجود چیچک ہو گئی تھی، جس میں اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے جاتی رہیں۔ گیتا جو ایک اچھی بیٹی، بہن، بیوی، ماں اور دوست تھی، سب کا کہا مانتی تھی، لیکن اس نے کیوں ضد پکڑ لی؟ یہ کیسا

انکار تھا جو اس کے مُنہ سے نکلا تھا؟ کون سا ہاتھ تھا جو اسے موت کی طرف کھینچ رہا تھا؟ ہو سکتا ہے گیتا سے یہ بھول نہ ہوتی تو وہ آج اپنے بچّوں ملی اور کاجل، اپنے میاں شمی، اپنے بہن بھائیوں اور ان گنت عزیزوں اور دوستوں کے درمیان ہوتی۔ لیکن کہیں اس کا چہرہ مسخ ہو جاتا یا آنکھیں چلی جاتیں تو کیا ہوتا؟ گیتا جو زندگی میں اپنی ہی شرط پر جینے کی عادی تھی، کیسے مشروط زندگی سے مصالحت کر لیتی؟ اسے دیکھ کر اُس کے لاکھوں چاہنے والوں کا کیا حال ہوتا؟ اپنے چاہنے والوں کو نہ دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوتی؟ اس قسم کے سوال پھر La-mystique کی حدیں چھونے لگتے ہیں اور آخر مبتلائے عقل آدمی اس حقیقت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے جو ایک ہی جست لے کر زندگی کی باقی سب حقیقتوں سے آگے آکھڑی ہوتی ہے اور وہ ہے موت۔ یہ سچ ہے کہ گیتا آج نہیں ہے۔ اس پار آکر اُس کے بڑے سے پتّے پر لڑھکنے والے شبنم کے قطرے کو چِتا کی آگ نے دھواں بنا دیا ہے۔ وہ بمبئی میں بان گنگا کے شمشان میں جلائی جا چکی ہے اور اس کی روح ایک ایسی شانتی پا چکی ہے جس کی تمنّا گیتا نے ہرگز نہ کی تھی، کیونکہ اس نے اضطراب کا راز پا لیا تھا۔

بان گنگا کے شمشان کے ساتھ وہ مندر تھا جہاں دس برس پہلے گیتا نے اپنا ہاتھ شمی کے ہاتھ میں دیا تھا اور پیار نبھانے کی سوگند لی تھی۔ اس نے تو اپنی سوگند نبھا دی، لیکن شمی کی سوگند کا کیا ہوا؟ وہ شمی سے محبّت کرتی تھی، ایسی محبّت جو ہمارے شاستروں اور مریادا نے ایک پتنی کو تفویض کی ہے۔ وہ بیک وقت پتنی، دوست اور ماں تھی اور ایک فاصلے سے اپنے پتی کے کھلنڈرے پن کو دیکھا کرتی تھی۔ شمی کے پیار میں بھی وہی والہانہ پن تھا جسے میں نے گیتا کی باتوں کے بین السطور جانا ہے۔ چنانچہ جتنے دن گیتا بیمار رہی، شمی اپنا سب کام چھوڑ کر گیتا کی نگہداشت کرتے رہے۔ اس کی جانکاہی میں محبّت کے کئی چھوٹے اور بڑے وعدے کیے اور نیازیں گزاریں، جو ایک طرح کے واسطے تھے قضا و قدر کو، جو قسمت نے تسلیم نہ کیے۔ جب ان کی شادی ہوئی تھی تو مندر کے بُت، ساحل کے سنگریزے، سمندر کی لہریں اور اس وقت کا آسمان جانتے تھے، لیکن ان سب نے مل کر اس حسین جوڑے کو چند برس کے لیے عشرت کی چھوٹ دے دی تھی۔

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن

دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

میں نے اس مُضطرب روح کو اس کے بچپن ہی سے دیکھا ہے۔ گیتا، لاہور میں ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ جب بھی وہ نظر کی پہیلی کی طرح، یہ تھی وہ گئی، قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے دبلے پتلے بدن اور گورے چٹے چہرے میں ایک ہی چیز، باقی کے تمام خدوخال سے نمایاں تھی اور وہ تھیں اس کی بڑی بڑی آنکھیں، جن میں حیرت تھی، جستجو تھی۔ خوب سے خوب تر کی جستجو۔ وہ ہر بات کی ماہیت جاننا چاہتی تھی اور اس کے لیے کوئی بھی قیمت دینے کو تیّار تھی۔ اس کی آنکھیں پپوٹوں میں ایک تیز گراری کی طرح سے چلتی تھیں اور یہ تھا بھی ٹھیک، کیونکہ انہیں سو سال کا سفر چونتیس برس ہی میں طے کرنا تھا۔ گیتا کی آنکھیں درسی کتاب پر اتنا نہ رکیں جتنا کتابِ زندگی پر۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ مضمون کے آر پار نکل سکتی تھی۔ ورنہ عام کتاب میں تو الفاظ اور پھر کاغذ نظر کی پرواز کو جکڑ لیتے ہیں۔ اس کی حیرت انگیز سمجھ بوجھ ایک عام تعلیم یافتہ آدمی سے کہیں زیادہ تھی، کیونکہ اس علم کا مدار وجدان پر تھا۔ لیکن اس کی نگاہوں میں کہیں ایک لمحہ ساکت تھا، جسے بہت کم لوگوں نے دیکھا۔ نظروں کی قوس میں ایک مقام خالی تھا، جہاں تک کوئی نہ پہنچا۔

چند لوگوں نے فروعی طور پر ان آنکھوں کے سحر کو جانا اور غالباً اسی لیے انہیں صرف شوخی اور چلبلے پن اور کہیں ایک آدھ جذباتی سین میں استعمال کر سکے۔ پہلی فلم، جس میں گیتا نے منفرد اداکاری کی، سہاگ رات تھی، جس کی شوٹنگ ہی کے دوران میں ہدایت کار نے اس نظر کے اُٹھنے اور جھکنے کے بیچ نغمہ و سحر بھی دیکھ لیا اور آہِ صبح گاہی بھی اور اپنی اگلی تصویر کا نام ''باورے نین'' رکھ لیا۔ لیکن گیتا کے نام لینے کے باوجود وہ ان شاہین بچّوں کے پرِ پرواز کی قوّت اور ان کی اڑان کا اندازہ نہ کر پائے۔ ان کا اندازہ گیتا کو تھا لیکن غیر شعوری طور پر۔ آخر کوئی وجہ تھی کہ جب گیتا نے اپنی تصویر 'رانو' بنانے کا فیصلہ کیا، تو اپنے ادارے کا علامتی نشان دو آنکھیں رکھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، جو ایک طرف تو بدری ناتھ کے مندر پر بنی ہوئی بھگوان وشنو ناتھ کی آنکھیں تھیں، جو منزلوں دور سے آنے والے یاتریوں کو دیکھتی اور ان کی رکھشا کرتی ہیں، اور دوسری طرف دیوی کی آنکھیں، جو انسانی زندگی کو اس کے پاپ اور پُن میں دیکھتی ہیں۔ من اور اس کی ورتیوں کے آر پار چلی جاتی ہیں اور ہر جذبے کے ساتھ رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ ابھی ان میں دَیا ہے، ابھی کرونا اور ابھی چنڈی کا کوپ۔ ابھی جزا ہے، ابھی سزا اور پھر

چھما۔ آنکھیں نہ صرف دل کا آئینہ ہیں، بلکہ باہر کی دنیا کو بھی دیکھتی ہیں اور اس کا عکس دل میں اُتار لیتی ہیں۔ ان کا اوّل اور آخر مقصد ہے دیکھنا اور اپنا آپ دکھانا لیکن ہر گاہ خاموش رہنا۔ ایسی خاموشی کہ نطق بھی جس کے سامنے پانی بھرے اور یہ گیتا کی خاص بات تھی۔ وہ بات کرنے والے کی طرف ٹک ٹک یوں دیکھتی تھی کہ وہ بعض اوقات گھبرا اُٹھتا تھا۔ لیکن اسے گیتا اور اپنے رشتے کے بارے میں فوراً پتا چل جاتا۔ ابھی وہ آپ کی دوست ہیں، ابھی دُشمن، پھر دوست نہ دُشمن، ایک ہی لمحے پہلے ہستی سے معمور وہ آنکھیں اُچٹ کر نیستی کی منزلوں میں گم ہو گئی ہیں۔۔۔

مجھے اس سے دل چسپی نہیں کہ گیتا نے فلمی دنیا میں کامیابی کا سنگلاخ راستہ کیسے طے کیا، یا وہ کون کون سی تصویروں میں آئی۔ مجھے کتاب سے دلچسپی ہے، اس کے ابواب کی فہرست سے نہیں۔ اگر کسی فلم میں اسے کامیابی کا مُنہ دیکھنا نصیب ہوا تو اس لیے کہ کہانی یا منظر اس کی وجدانی سمجھ میں آ گیا، یا کوئی ذہین ہدایت کار جزوی طریقے سے پھر اُسے گیتا کے ذہن میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اکثر اور بیشتر ہمارے ہدایت کار اپنی مجبوریوں کے باعث گیتا سے وہ کام نہ

لے سکے جس کی صلاحیت گیتا میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی اچھی کہانی، کسی اچھے خیال اور جذبے کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی۔ کبھی ماحول کی مناسبت اور کردار کے اچھے ہونے سے اسے کام کرنے میں مزا آتا اور کبھی خانہ پُری کر دیتی اور اپنے تنہائی کے لمحوں میں بیٹھ کر رو دیتی۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ فلم اور فلمی اداکاری کے بارے میں گیتا کی نظرِ انتقاد اتنی بُلند تھی۔ کہتے ہیں کہ عنقا کا آشیانہ بُلند ہوتا ہے لیکن گیتا کا ٹھکانہ عنقا کے آشیانے سے کہیں اُوپر تھا۔ یعنی وہاں جہاں کبیر کے ایک بھجن کے مطابق، بغیر بادلوں کے بجلی چمکتی ہے اور سورج اجیارا ہوتا ہے۔ جہاں آنکھوں کے بغیر موتی پروئے جاتے ہیں اور بنا شبد کے شبد کا اُچارن ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار باتوں باتوں میں میں نے کچھ ایسے فلم بنانے والوں کے نام لے دیے جنھیں نہ صرف ہمارا ملک بلکہ باہر ملکوں کے لوگ بھی مانتے ہیں۔ مُڑ کر دیکھا تو گیتا کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ اِس سے پہلے کہ میں اس کی وجہ پوچھتا، گیتا میرے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی اور پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے اِلتجا کر رہی تھی کہ میں آئندہ اس کے سامنے کبھی ان لوگوں کے نام نہ لوں۔ وفورِ جذبات میں وہ چند ایسے نام

بھی لے گئی، جو اس کے اپنے قریب کے تھے۔ وہ فلم 'رانو' کو کسی ایسے ہی دیکھے نہ سنے انداز میں بنانا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے لیے وہ مقام متعیّن کر رکھا تھا جس تک آج تک کوئی نہ پہنچا۔ شاید مرے بغیر وہ خود بھی نہ پہنچ سکتی تھی۔ جب مجھے پتا چلا کہ گیتا کس دیس کی باسی ہے۔۔۔

میں نہیں جانتا اسے میں اپنی اس وقت کی خوش قسمتی کہوں یا اس وقت کی بد قسمتی کہ خود میرے اور اپنے عزیز دوستوں کے منع کرنے کے باوجود گیتا نے میرے ناول ''ایک چادر میلی سی'' کو فلمانے کا فیصلہ کر لیا۔ گیتا کے پاس یہ ناول میرے دوست وید صاحب لے گئے تھے، جنھیں آخر اس فلم کا ہدایت کار ہونا تھا۔ ہماری، گیتا کو منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ''ایک چادر میلی سی'' کی کہانی ہماری مروّجہ فلمی کہانیوں سے یکسر الگ تھی۔ چھوٹتے ہی اس کی نائیکہ رانو چار بچّوں کی ماں دکھائی دیتی تھی۔ پھر اپنی بد کرداریوں کے کارن اس کا پتی قتل ہو جاتا ہے اور رانو کو اپنے دیور پر چادر ڈالنا، اس کے ساتھ شادی کرنا پڑتی تھی، جو عمر میں اس سے گیارہ سال چھوٹا تھا اور جسے اس نے ایک بچّے کی طرح پالا تھا۔ گیتا کو رانو کے کردار میں ایک بہت بڑی رینج دکھائی دی اور وہ اس پر مر مِٹی۔ رانو اور گیتا

میں کیا مماثلت تھی؟ غالباً یہی کہ دونوں نے دُکھ دیکھا تھا۔ اپنی فلسفیانہ تحلیل میں رانو دیوی تھی کیونکہ اس نے زندگی کو ایک بھرپور طریقے سے جیا۔ اُس نے مار کھائی، مار۔ اپنے پیٹ، اپنی بیٹی، اپنی محبّت کے لیے اس نے میٹھے مالٹے، شراب کی بوتل توڑی اور پھر اپنے دیور کو رام کرنے کے لیے اسے پلائی بھی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود دیور نے اس کے سارے پاپ شما کر دیے۔ یہی نہیں وہ خود دیوی ہوگئی۔۔۔ دیا اور کرونا کے پرساد بانٹنے لگی۔۔۔ رانو کے کردار نے گیتا کے دل میں ایک عجیب سی گھلاوٹ پیدا کر دی تھی اور وہ جان گئی تھی کہ زندگی کے بھلے برے کے آخر میں موکش ہے۔ چنانچہ میرے ناول کی نائیکہ اور یہ نائیکہ، دونوں آخر موکش کو پہنچ گئیں اور میں بیچ ہی میں رہ گیا۔

اس بات سے گیتا کے بہت سے قریبی لوگ بھی واقف نہیں کہ گیتا کو Father fixation تھا۔ اس کی سب حرکتیں ایک 'اناتھ' لڑکی کی طرح تھیں۔ وہ کھلتی تو بے تحاشا کھلتی اور جب سمٹتی تو ایک پھول کی طرح اپنی پنکھڑیاں کچھ اس انداز سے بند کر لیتی کہ سب کیڑے مکوڑے اس میں گھُٹ کر مر جاتے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ورسوا میں اس کے پِتا کا انتقال ہوا۔ میں مُردے سے بہت

ڈرتا ہوں، لیکن نہ معلوم یہ کیسا رشتہ تھا کہ میں نے اپنے ہاتھ سے گیتا کے باپ کو نہلایا۔ جب سے گیتا نے میری طرف اس انداز سے دیکھنا شروع کر دیا جیسے کوئی بیٹی باپ کی طرف دیکھتی ہے۔ چنانچہ وہ مجھے اپنی تصویر 'رانو کا باپ' کہا کرتی تھی۔

گیتا کے دل میں تخلیق اور اس کے خالق کے لیے بے پناہ جذبہ تھا اور عقیدت تھی۔ چاہے وہ زندگی اور فن کا کوئی شعبہ ہو، وہ پائے کے مصوّروں، موسیقاروں، شاعروں اور مصنّفوں کے سامنے یوں ہتھیار ڈال دیتی، جیسے اس کی اپنی کوئی شرط ہوتی ہو۔ وہ انہیں اپنے دل میں وہی درجہ دینے لگتی، جو عام آدمی کسی اوتار یا ولی اللہ کو دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب کوئی اس کے ایثار، اس کے بُلند معیار پر پورا نہ اترتا، تو اسے برابر ہی کی مایوسی ہوتی اور پھر ایکا ایکی اسے جھٹک بھی دیتی۔ وہ مثالیت کی گرویدہ تھی اور اس سلسلے میں اسے کئی بار اپنے ارد گرد کے ماحول سے ٹکر لینا پڑتی۔ لیکن چونکہ گیتا کا پل تتو درن تھا، اس لیے وہ مچھلی کی طرح ہمیشہ دھارے کے خلاف، زندگی کے آبشار کے اوپر ہی اوپر پہنچنے کی کوشش کرتی۔ بیچ میں ایسے لمحے بھی آئے جب وہ عملی زندگی کے

ساتھ مصالحت کے سلسلے میں ہار بھی جاتی۔ جب وہ خاموش ہو جاتی اور صرف کسی نگاہ والے ہی کو اس کی اندرونی کیفیت کا پتا چلتا۔ اس کی شکل سمندر کی سی ہوتی جو اوپر، سطح پر سے تو شانت نظر آتا ہے لیکن اندر، اپنے سینے میں بڑ دانل لیے ہے، جب اس کا راز اُگلوانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوتا۔۔۔ البتّہ پتا اس وقت چلتا جب کچھ کشتیاں ڈوبی ہوئی ملتیں، کچھ بادبان اور مستول ٹوٹی پھوٹی حالت میں کنارے پر آ لگتے۔

اس سے پہلے مجھے ایک فلمی رسالے میں گیتا کے بارے میں لکھنے کا اتفاق ہوا۔ گیتا نے مجھ سے کہا۔۔۔ آپ لیکھک ہیں۔ آپ جو جی چاہے، میرے بارے میں لکھیے، اور اس سلسلے میں کسی کی پروانہ کیجیے۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا گیتا! پھر میں نے اپنے مبہم طریقے سے اس سے پوچھا۔ کیا میں اس بڑ دانل کے بارے میں لکھ سکتا ہوں؟ جس کا بھید تم نے مجھ پر بھی ظاہر نہیں کیا۔ لیکن تمہارا چہرہ، تمہاری آنکھیں اس کی غمازی کرتے ہیں؟۔۔۔ کیا میں وہ سب لکھ دوں؟

گیتا کے ساتھ وید بھی بیٹھے تھے۔ گیتا نے مُڑ کر میری آنکھوں میں دیکھا اور بول اٹھی۔۔۔ ”نہیں!“

اس کے بعد گیتا 'رانو' کی شوٹنگ کے لیے اپنا پورا یونٹ لے کر بنگلہ، پنجاب چلی گئی، جہاں اس نے عام دیہاتی عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا، انہیں کی طرح کے کپڑے پہنے۔ ویسے ہی جاگتی، ویسے ہی سوتی۔ اور ان سے زندہ رہنے کا وہ فن سیکھا جس کے بعد زندہ رہنے کی حسرت ہی نہیں رہ جاتی۔ ایک تالاب کے کنارے رانو کا گھر تھا، جس میں گیتا رہتی تھی۔ گاؤں کے سب لوگ اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ اس کے گھر کے دروازے آج بھی یوں کھلے ہیں جیسے چونک جانے کے بعد کسی کا مُنہ کھل جاتا ہے۔

گیتا دو برس رانو کے ساتھ سوئی اور اسی کے ساتھ جاگی۔ وہ اسے اس کے مصنّف سے کہیں زیادہ جاننے لگی تھی۔ وہ خود رانو ہو گئی تھی۔ وہ مجھے خط بھی لکھتی تو اس پر رانو ہی کے دستخط ہوتے۔ پھر وہ بمبئی لوٹ آئی اور ۱۲ جنوری کی صبح کو گیارہ بج کر دس منٹ پر چل پڑی۔ یہ سب کتنا تیز تیز ہوا۔۔۔ پونے گیارہ تک تو میں عیادت کے سلسلے میں اس کے ہاں تھا۔ گیتا کے سسر پرتھوی راج کپور، اس کے پتی شمی، ڈاکٹر سب نے یقین دلایا کہ وہ اب خطرے سے باہر ہے۔ ان کے چہرے پر رونق چلی آئی تھی اور رَت جگوں کے نقوش مٹنے لگے تھے۔ باہر آ کر میں نے

بیوی کی تسلّی کے لیے اسے فون کر دیا۔

گھر لوٹا تو میری بیوی رو رہی تھی۔ ایک اور فون آ گیا تھا۔

میں گھر سے اپنی وہ کتاب جو پنجابی میں چھپی ہوئی تھی اور جس پر گیتا کی تصویر تھی، اسے ساتھ لیتا گیا۔ میں چاہتا تھا گیتا کے ساتھ اسے بھی شعلوں کے نذر کر دوں، کیونکہ گیتا نے اسے مجھ سے زیادہ جانا تھا۔ پھر میں نے سوچا۔۔۔ شاید یہ جذباتیت ہو گی۔ فلم کے لوگ اسے دکھاوا سمجھیں گے۔

چتا کے شعلے بلند ہوئے، میری ہمّت پست ہو گئی۔

میں چُپکے سے ساحل کی طرف سٹک گیا اور کتاب سمندر میں پھینک دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لہروں کے ساتھ واپس آنے لگی۔ گیتا مجھے کتاب لوٹانے لگی۔ میں نے کہا۔۔۔ نہیں گیتا! یہ تمہاری ہے۔ اسے تم ہی فلماؤ گی۔ دوسرا کوئی نہیں۔

۔۔۔ ہو سکتا ہے آج سے پینتیس چالیس برس بعد کسی بڑی بڑی آنکھوں والی اداکارہ کی نظر اس کتاب پر پڑے اور وہ اپنا آپ اس میں دیکھ لے۔ اسے فلمانے کا تہیّہ کر لے۔ صرف اسے یہ پتا نہ ہو گا کہ پچھلے جنم میں وہ گیتا تھی۔